نومبر ۲۰۱۰ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ہمارا دین ''دینِ توحید'' ہے اور ''توحید'' کی ضِد ''شرک'' ہے۔
- شرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔
- قرآن کی رو سے شرک ''ظلمِ عظیم'' ہے۔
- شرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
- مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت' اور دورِ حاضر کے شرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت و اَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے چھ فکر انگیز خطابات

- معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ● عمدہ طباعت ● 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 50 روپے' اشاعت خاص: 90 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خدام القرآن لاهور**

36۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

Email:maktaba@tanzeem.org Website:www. tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 59

شمارہ : 11

ذوالحجہ 1431ھ

نومبر 2010ء

فی شمارہ 25/-

مدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیوٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ______ 3

انسان، اشرف المخلوقات کیونکر؟ — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ______ 5

سورۃ المائدۃ (آیات ۹۴ تا ۱۲۰) — ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کا نظامِ حیات ______ 25

اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام — ڈاکٹر اسرار احمد

تذکیر و موعظت ______ 70

رزقِ حلال کی برکتیں اور رزقِ حرام کا وبال — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یادِ رفتگاں ______ 77

○ وہ میر کارواں تھا جو چلا گیا — صہیب حسن

○ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ — ضمیر اختر خان

❁ ❁ ❁

عرضِ احوال

انسان‘ اشرف المخلوقات کیونکر؟؟

تمام جاندار مخلوق یعنی انسان‘ حیوان اور چرند و پرند تین ایسے بنیادی داعیات رکھتے ہیں جو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ناگزیر ہیں: (i) رزق کی تلاش (ii) اپنی جان کی حفاظت اور اسے خطرات سے بچانا (iii) اپنی نسل کی بڑھوتری یا جنسی خواہش کی تکمیل۔ بر و بحر میں موجود جاندار مخلوق کی ضروریات ان مذکورہ فطری داعیات سے زائد ہوسکتی ہیں کم نہیں ہوسکتیں اور یہ تمام جاندار اپنی ان بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر لحہ سرگرم نظر آتے ہیں‘ ہر روز سرگرداں ہوتے ہیں۔ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان مشترکہ بنیادی داعیات کے باوجود بہت مختلف ہے، اوراس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل وشعور رکھتا ہے اور اپنی بہتری کے لیے منصوبہ بندی کرنے کا فہم وادراک رکھتا ہے۔ اور اسی فاضل صفت کی وجہ سے اس نے تمام دنیا پر کنٹرول بھی حاصل کیا ہوا ہے اور دوسرے تمام جانداروں کو کسی نہ کسی انداز میں اپنے ماتحت بھی کیا ہوا ہے۔ اور یہ فرق ہے عقل‘ شعور اور تہذیب کا‘ یعنی دوسرے جاندار ان صفات سے محروم ہیں لہٰذا انسان کو ان پر تصرف حاصل ہے۔ ہماری رائے میں عقل و شعور کے حوالہ سے عددی لحاظ سے اور کوالٹی کی بنیاد پر یعنی quantitatively and qualitatively یقیناً انسان بہت آگے ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ زمین وآسمان کا فرق ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اسی فرق کی وجہ سے اسے زمین پر بالادستی حاصل ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ انسان کے علاوہ باقی جاندار یکسر عقل وشعور سے محروم ہیں اور اپنی ذات کے حوالہ سے منصوبہ بندی نہیں کر سکتے۔ روزمرہ زندگی میں اپنے اردگرد نگاہ ڈالیں‘ اپنے ماحول کا جائزہ لیں‘ آپ کو اللہ کی اس مخلوق کے عقل وشعور کے کئی مظاہر نظر آئیں گی‘ یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے بھی اپنے فہم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چیونٹی ان کیڑے مکوڑوں میں سے بھی اتنا چھوٹا جاندار ہے کہ بعض اوقات برہنہ آنکھ سے نظر بھی نہیں آتا۔ آپ اس کے راستے میں کوئی تنکا رکھ دیں وہ اپنا راستہ تبدیل کرلے گی‘ آپ پھر رکھ دیں وہ پھر تبدیل کرلے گی‘ آپ یہ عمل جاری رکھیں‘ آپ یہ دیکھیں گے کہ ایک موقع پر چیونٹی فیصلہ کرلے گی اور اس تنکے کے اوپر سے کراس کرنے کی کوشش کرے گی‘ یعنی اس نے اپنی عقل سے سمجھ لیا کہ کوئی اسے ٹارگٹ کر رہا ہے اور اب اس کا

سامنا کیے بغیر چارہ نہیں ہے‘ یعنی عقل کے حوالہ سے کمی بیشی کا معاملہ ہے۔ لیکن یہ انسان کو دوسرے جانداروں پر یکسر الگ تھلگ نہیں کرتی‘ یعنی انسان کا یہ امتیازی اور منفرد معاملہ نہیں ہے۔ اسی طرح چرند و پرند اور کیڑے موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے اپنی ضروریات کے مطابق منصوبہ بندی اور پیش بندی کرتے ہیں۔ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ انسان عقل کے معاملے میں ابتدائے آفرینش سے ہی دوسرے جانداروں سے آگے ہے۔ یاد رہے انسان نے اپنے ہم جنس یعنی دوسرے انسان کو دفن کرنا کوے سے سیکھا تھا‘ البتہ یہ حقیقت ہے کہ دوسرے جانداروں کی عقل کی پرواز بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور اس کی سیلنگ (sealing) بڑے چھوٹے لیول پر ہو جاتی ہے۔ جبکہ انسانی عقل کی پرواز بہت بلند ہے اور بہت آگے تک جاتی ہے اور روز بروز محو پرواز ہے‘ لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی بھی بہر حال ایک sealing ہے اور مادہ پرستوں کا یہ خیال خام ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ انسان عقلِ کُل کا مالک ہوگا اور زمین و آسمان کے تمام کھلے اور پوشیدہ راز پالے گا۔ ہمیں اس وقت یہ بحث نہیں کرنا کہ انسانی عقل کی انتہا کیا ہے اور کیا ہو سکتی ہے‘ ہمیں صرف یہ واضح کرنا تھا کہ عقل اور فہم و ادراک انسان کو دوسرے جانداروں سے ممیز نہیں کرتے بلکہ ایک دوسری شے ہے جو انسان کو دوسرے جانداروں سے مکمل طور پر الگ تھلگ کرتی ہے اور وہ ہے جس کا ذکر اللہ ربّ العزت نے قرآن پاک میں مختلف جگہوں میں کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۵ میں فرمایا:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

”یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں‘ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمہیں علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا۔“

روح یعنی امرِ ربی اللہ کی مخلوق میں سے انسان کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اور یہ ہے وہ شے جو انسان کو دوسرے جانداروں سے نہ صرف الگ تھلگ کر دیتی ہے اور منفرد حیثیت دیتی ہے بلکہ اسی امرِ ربی کی بنا پر انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔ اللہ ربّ العزت نے حضرت آدم علیہ السلام میں جب روح پھونکی تب ہی وہ مسجودِ ملائکہ ہوئے۔ اور یہ وہ مقام تھا جب شیطان نے دھوکہ کھایا۔ وہ انسان کو صرف مٹی اور پانی کے مرکب کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور خود سے تقابل کر رہا تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ روحِ ربانی پھونکے جانے سے اس مٹی اور پانی سے بنے جسم کی ہیئت ہی کس قدر بدل گئی ہے اور وہ کتنی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے!

آج کے سیکولر طبقہ کو چھوڑیے‘ اس کی جہالت اور غلط فہمی سمجھ میں آتی ہے اور وہ قابل معافی نہ سہی قابل رحم تو ہیں‘ قابل افسوس بات تو یہ ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ بھی جان اور روح کو گڈمڈ کر دیتا

(باقی صفحہ 95 پر)

سُورۃ المائدۃ

آیات ۹۴ تا ۱۰۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ
وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٤﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ
قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ
مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا
لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ
الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَاۗىِٕدَ ۭ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾ مَا عَلَي الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿٩٩﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ
كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾ ۱۳ ع ۷ ۲

اس سورۂ مبارکہ کے شروع میں حالتِ احرام میں شکار کرنے کی ممانعت آ چکی ہے۔ اب اللہ کی اس سنت کا ذکر ہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کو آزماتا ہے' سخت ترین امتحان لیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ حاجیوں کا ایک قافلہ جا رہا ہے' سب نے احرام باندھا ہوا ہے' اتفاق سے ان کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ اب ایک ہرن اٹھکیلیاں کرتے ہوئے قریب آ رہا ہے' بھوک بھی ستا رہی ہے' ضرورت بھی ہے' چاہیں تو ذرا سا نیزہ ماریں اور شکار کر لیں یا ویسے ہی بھاگ کر پکڑ لیں' لیکن پکڑ نہیں سکتے' شکار نہیں کر سکتے' کیونکہ احرام میں ہیں اور اس حالت میں اجازت نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح آزماتا ہے۔

آیت ۹۴ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ تمہیں لازماً آزمائے گا کسی ایسے شکار کے ذریعے''

﴿تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ﴾ ''جس کو پہنچتے ہوں گے (آسانی سے) تمہارے ہاتھ اور نیزے''

﴿لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ﴾ ''تاکہ اللہ دیکھ لے اُن لوگوں کو جو غیب میں ہوتے ہوئے بھی اُس سے ڈرتے رہتے ہیں۔''

شکار پہنچ میں بھی ہے' ان کے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہے' ضرورت بھی ہے' چاہیں تو شکار کر لیں' لیکن مجبور ہیں' کیونکہ احرام باندھا ہوا ہے۔ تو جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ اپنی بھوک کو برداشت کرے گا' اللہ کے حکم کو نہیں توڑے گا۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۴﴾﴾ ''اب اس کے بعد جس نے زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۹۵ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ﴾ ''اے ایمان والو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو کسی شکار کو قتل مت کرو۔''

﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ ''تو جو کوئی تم میں سے اسے قتل (شکار) کر بیٹھے جان بوجھ کر' تو پھر اس کا کفارہ ہوگا اسی طرح کا ایک چوپایہ جیسا کہ اُس نے قتل کیا''

کفارے کے طور پر اللہ کی راہ میں ویسا ہی ایک چوپایہ صدقہ کیا جائے گا۔ یعنی اگر آپ

نے ہرن مارا تو بکری یا بھیڑ دی جائے گی اور اگر نیل گائے مار دی تو پھر گائے بطور کفارہ دینا ہوگی۔ اس طرح جس قسم اور جس جسامت کا حیوان شکار کیا گیا ہے' اس کے برابر کا چوپایہ صدقہ کرنا ہوگا۔

﴿یَحْکُمُ بِہٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ﴾ ''جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے''

یعنی دو متقی اور معتبر اشخاص اس کی گواہی دیں کہ یہ جانور اس شکار کیے جانے والے جانور کے برابر ہے۔

﴿ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ﴾ ''یہ نذر کی حیثیت سے خانہ کعبہ تک پہنچایا جائے''

یہ جانور ہدی کے طور پر خانہ کعبہ کی نذر کیا جائے گا۔

﴿اَوْ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیْنَ﴾ ''یا پھر اس کا کفّارہ ہے کچھ مساکین کو کھانا کھلانا''

اس میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر اناج یا رقم دینا ہو تو وہ صدقۂ فطر کے حساب سے ہوگی۔

﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا﴾ ''یا اتنے ہی روزے رکھنا''

یہ دیکھنا ہوگا کہ جو جانور شکار ہوا ہے اسے کتنے آدمی کھا سکتے تھے۔ اتنے آدمیوں کو کھانا کھلایا جائے یا اتنے دن کے روزے رکھے جائیں۔

﴿لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِہٖ ط﴾ ''تا کہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔''

﴿عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ ط﴾ ''اللہ معاف کر چکا ہے جو پہلے ہو چکا ہے۔''

﴿وَمَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰہُ مِنْہُ ط وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾﴾ ''لیکن جو کوئی پھر ایسا کرے گا تو اللہ اُس سے انتقام لے گا' اور یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' انتقام لینے والا۔''

آیت ۹۶ ﴿اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُہٗ﴾ ''(البتہ) تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے سمندر کا شکار اور اُس کا کھانا''

سمندر اور دریا کا شکار حالتِ احرام میں بھی حلال ہے۔ حاجی لوگ اگر کشتیوں اور بحری جہازوں کے ذریعے سے سفر کر رہے ہوں تو وہ احرام کی حالت میں بھی مچھلی وغیرہ کا شکار کر سکتے ہیں۔

﴿مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِلسَّیَّارَۃِ ج﴾ ''تمہارے لیے اور مسافروں کے لیے زادِ راہ کے طور پر۔''

سمندر کی خوراک (sea food) تو یوں سمجھ لیجیے کہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے غذا کا ایک نیا خزانہ ہے جو سامنے آیا ہے۔ یہ بہت سی خرابیوں اور بیماریوں سے بچانے والی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں یہ آج کل بہت مقبول ہو رہی ہے۔

﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا﴾ ''لیکن خشکی پر شکار کرنا تمہارے لیے حرام کر دیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام میں ہو۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو جس کی طرف تمہیں جمع کر دیا جائے گا۔''

تم سب اُس کی طرف گھیراؤ کر کے لے جائے جاؤ گے۔

آیت ۹۷ ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ ''اللہ نے کعبے کو' جو کہ بیت الحرام ہے' لوگوں کے قیام کا باعث بنا دیا ہے''

﴿وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ﴾ ''اور حرمت والا مہینہ' قربانی کے جانور اور وہ جانور بھی جن کے گلوں میں پٹے ڈال دیے گئے ہوں''

یہ سب اللہ تعالیٰ کے شعائر ہیں اور اسی کے معیّن کردہ ہیں۔ سورۃ کے شروع میں بھی ان کا ذکر آ چکا ہے۔ یہاں دراصل توثیق ہو رہی ہے کہ یہ سب چیزیں زمانہ جاہلیت کی روایات نہیں ہیں بلکہ خانہ کعبہ کی حرمت اور عظمت کی علامت ہیں۔

﴿ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ''یہ اس لیے کہ تم اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کی ہر شے کا علم ہے''

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾﴾ ''اور یہ کہ اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔''

آگے چل کر اِن چیزوں کے مقابلے میں اُن چار چیزوں کا ذکر آئے گا جو اہلِ عرب کے ہاں بغیر کسی سند کے حرام کر لی گئی تھیں۔

آیت ۹۸ ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾﴾ ''جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے اور یہ کہ اللہ غفور اور رحیم بھی ہے۔''

یعنی اُس کی تو دونوں شانیں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اب دیکھو کہ تم اپنے آپ کو کس شان کے ساتھ متعلق کر رہے ہو اور خود کو کیسے سلوک کا مستحق بنا رہے ہو؟ اس کی عقوبت کا یا اس

کی رحمت اور مغفرت کا؟

آیت ۹۹ ﴿مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ﴾ ''رسول (ﷺ) پر سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ﴿۹۹﴾﴾ ''اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔''

جب رسول اللہ ﷺ نے پیغام پہنچا دیا تو باقی ساری ذمہ داری اب تمہاری ہے۔

آیت ۱۰۰ ﴿قُلۡ لَّا يَسۡتَوِى الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوۡ اَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ الۡخَبِيۡثِ﴾ ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے' چاہے ناپاک شے کی کثرت تمہیں اچھی لگے۔''

انسان تو چاہتا ہے کہ اُس کے پاس ہر شے کی بہتات ہو' لیکن ناجائز اور حرام طریقے سے کمایا ہوا مال اگرچہ کثرت سے جمع ہو گیا ہو مگر ہے تو خبیث اور ناپاک ہی۔ بے شک اس کی چکا چوند تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو مگر اس میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴿۱۰۰﴾﴾ ''تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو' تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آیات ۱۰۱ تا ۱۰۸

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡيَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ‌ۚ وَاِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا
عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَكُمۡ‌ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ﴿۱۰۱﴾
قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ
بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ‌ۙ وَّلٰـكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ
اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ
اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا
حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ
مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ
تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا
وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ فَاِنْ عُثِرَ
عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ
عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا
اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى
وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ع ۱۴/۸

آیت ۱۰۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ﴾

”اے اہلِ ایمان! اُن چیزوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بُری لگیں۔“

یہ ایک خاص قسم کی مذہبی ذہنیت کا تذکرہ ہے۔ بعض لوگ بلاضرورت ہر بات کو کھودنے‘ کُریدنے اور بال کی کھال اُتارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر کسی چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود خاموشی اختیار فرمائی ہے تو اس بارے میں خواہ مخواہ سوال کرنا اپنی ذمہ داری کو بڑھانے والی بات ہے۔ چنانچہ حج کے بارے میں جب سورۂ آل عمران (آیت ۹۷) میں حکم نازل ہوا تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضور کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ ﷺ نے سوال سن لیا لیکن رُخِ مبارک دوسری طرف کر لیا۔ اب وہ صاحب اُدھر تشریف لے آئے اور پھر

عرض کیا' حضور کیا حج ہر سال فرض ہے؟ حضورﷺ نے پھر اعراض فرمایا۔ جب انہوں نے یہی سوال تیسری مرتبہ کیا تو پھر آپﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ دیکھو اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم لوگوں پر قیامت تک کے لیے ہر سال حج فرض ہو جائے گا۔ جس چیز میں اللہ تعالیٰ نے احتمال رکھا ہے اُس میں تمہاری بہتری ہے۔ جو شخص ہر سال کر سکتا ہو وہ ہر سال کر لے' لیکن فرضیت کے ساتھ ہر سال کی قید اللہ نے نہیں لگائی ہے۔ بے جا سوال کر کے تم اپنے لیے تنگی پیدا نہ کرو۔ جیسے گائے کے معاملے میں بنی اسرائیل نے کیا تھا کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کی عمر کیا ہو؟ اور کیسی گائے ہو؟ وغیرہ وغیرہ' جتنے سوالات کرتے گئے اتنی ہی شرائط لاگو ہوتی گئیں۔ اس نوعیت کے سارے سوال اسی ضمن میں آتے ہیں۔

﴿وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَكُمْ﴾ ''اور اگر تم سوال کرو گے ایسی چیزوں کے بارے میں جبکہ ابھی قرآن کا نزول جاری ہے تو تمہارے لیے وہ ظاہر کر دی جائیں گی۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت کئی چیزوں کو پردے میں رکھا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کو ظاہر کرنے میں تمہارے لیے تنگی ہو جائے گی' بوجھ زیادہ ہو جائے گا' یہ تم پر گراں گزریں گی۔ لیکن اگر سوال کرو گے تو پھر ان کو ظاہر کر دیا جائے گا۔

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ نے اس میں درگزر سے کام لیا ہے' اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔''

بعض چیزوں کے بارے میں جو اللہ نے تم پر نرمی کی ہے اور تمہیں تنگی سے بچایا ہے' وہ اس لیے ہے کہ وہ غفور اور حلیم ہے۔ یہ کسی نسیان' بھول یا غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا (معاذ اللہ!)

آیت ۱۰۲ ﴿قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾﴾ ''تم سے پہلے ایک قوم (اہلِ کتاب) نے اس قسم کے سوالات کیے تھے اور پھر وہ ان کا انکار کرنے والے بن گئے تھے۔''

اب یہاں ان چار چیزوں کا ذکر آ رہا ہے جو ان کے ہاں خواہ مخواہ بہت زیادہ مقدس ہو گئی تھیں۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے اُن چار شعائر کے مقابلے کی چار چیزیں ہیں جن کا ذکر پیچھے آیت ۹۷ میں ہوا ہے: ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ﴾ وہاں ان چار چیزوں کی توثیق کی گئی تھی کہ وہ واقعتاً اللہ کی شریعت کے

اجزاء ہیں' ان کا احترام اور ان کی حرمت کو ملحوظ رکھنا اہلِ ایمان پر لازم ہے۔ لیکن یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے کہ کچھ چیزیں تمہارے ہاں ایسی رائج ہیں جو دورِ جاہلیت کے مشرکانہ اوہام کی یادگاریں ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۱۰۳ ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ﴾ ''اللہ نے نہ تو بحیرہ کو کچھ چیز بنایا ہے' نہ سائبہ' نہ وصیلہ اور نہ حام کو''

ان چیزوں کے تقدس کی اللہ کی طرف سے کوئی سند نہیں۔ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں' لیکن جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیب ؒ نے ان الفاظ کی جو تفصیل بیان کی ہے' وہ صحیح بخاری (کتاب تفسیر القرآن) میں وارد ہوئی ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی اسے اپنے حواشی میں نقل کیا ہے۔ بحیرہ: ایسا جانور جس کا دودھ بتوں کے نام کر دیا جاتا تھا اور کوئی اسے اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ سائبہ: وہ جانور جو بتوں کے نام پر' ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح' چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچوں کو جنم دیتی اور درمیان میں کوئی نر بچہ پیدا نہ ہوتا' اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حام: نر اونٹ جو ایک خاص تعداد میں جفتی کر چکا ہوتا' اُسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرح کے جانوروں کو بتوں کے نام منسوب کر کے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا کہ اب انہیں کوئی ہاتھ نہ لگائے' کوئی ان سے استفادہ نہ کرے' کوئی ان کا گوشت کھائے نہ صدقہ دے' نہ ان سے کوئی خدمت لے' بس ان کا احترام کیا جائے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے کوئی احکام نہیں دیے گئے' بلکہ فرمایا:

﴿وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝﴾ ''لیکن یہ کافر اللہ پر افترا کرتے ہیں' اور ان کی اکثریت عقل سے عاری ہے۔''

یہ لوگ بغیر سوچے سمجھے اللہ کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے رہتے ہیں۔

آیت ۱۰۴ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ﴾ ''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ اللہ کے رسول کی طرف''

اس حکم (کہ آؤ اللہ کے رسول کی طرف) کی ترجمانی علامہ اقبال نے کیا خوبصورت الفاظ میں کی ہے: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

﴿ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا ؕ﴾ ''وہ کہتے ہیں ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔''

یعنی ہمارے آباء واجداد جو اتنے عرصے سے ان چیزوں پر عمل کرتے چلے آ رہے تھے تو کیا وہ جاہل تھے؟ یہی باتیں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ کسی رسم کے بارے میں آپ کسی کو بتائیں کہ اس کی دین میں کوئی سند نہیں ہے اور صحابہؓ کے ہاں اس کا کوئی وجود نہ تھا تو اس کا جواب ہوگا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو یونہی کرتے دیکھا ہے۔

﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ ''خواہ ان کے آباء و اَجداد ایسے رہے ہوں کہ نہ انہیں کوئی علم حاصل ہوا ہو نہ ہی وہ ہدایت پر ہوں (پھر بھی)؟''

جیسے تم اللہ کی مخلوق ہو ویسے ہی وہ بھی مخلوق تھے۔ جیسے تم غلط کام کر سکتے ہو اور غلط آراء قائم کر سکتے ہو ویسے ہی وہ بھی غلط کار ہو سکتے تھے۔

آیت ۱۰۵ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر ذمہ داری ہے صرف اپنی جانوں کی۔''

﴿لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ﴾ ''جو کوئی گمراہ ہو جائے وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا' جبکہ تم ہدایت پر ہو۔''

﴿ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ ''اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کا ایک غلط مطلب اور مفہوم دورِ صحابہؓ میں ہی بعض لوگوں نے نکال لیا تھا۔ وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کی کوئی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے' ہر ایک پر اپنی ذات کی ذمہ داری ہے' کوئی کیا کرتا ہے اس سے کسی دوسرے کو کچھ غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن جو کہہ رہا ہے کہ ''تم پر ذمہ داری صرف اپنی جانوں کی ہے۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا''۔ لہٰذا ہر کسی کو بس اپنا عمل درست رکھنا چاہیے' کوئی دوسرا شخص اگر غلط کام کرتا ہے تو اسے خواہ مخواہ روکنے ٹوکنے' اس کی ناراضگی مول لینے' اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے

علم میں آئیں تو آپؐ نے باقاعدہ ایک خطبہ دیا کہ لوگو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس آیت کا مطلب غلط سمجھ رہے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہاری ساری تبلیغ' کوشش' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باوجود اگر کوئی شخص گمراہ رہتا ہے تو اس کا تم پر کوئی وبال نہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ ''(اے نبیﷺ) آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی جہنمیوں کے بارے میں''۔ یعنی ہم یہ نہیں پوچھیں گے کہ ہم نے آپؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تھا اور پھر بھی یہ لوگ جہنّم میں کیوں چلے گئے؟ لیکن جہاں تک دعوت و تبلیغ' نصیحت و موعظت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق ہے' یہ تو فرائض میں سے ہیں۔ اس آیت کی رو سے یہ فرائض ساقط نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کا درست مفہوم یہ ہے کہ تمہاری ساری کوشش کے باوجود اگر کوئی شخص نہیں مانتا تو اب تمہاری ذمہ داری پوری ہوگئی۔ فرض کیجیے کہ کسی کا بچہ آوارہ ہوگیا ہے' والد اپنی امکانی حد تک کوشش کیے جا رہا ہے مگر بچہ راہِ راست پر نہیں آ رہا' تو ظاہر بات ہے کہ اگر اُس نے بچے کی تربیت اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں چھوڑی تو اللہ کی طرف سے اس کی گمراہی کا وبال والد پر نہیں آئے گا۔ لیکن اپنا فرض ادا کرنا بہرحال لازم ہے۔

آیت ۱۰۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان' تمہارے درمیان شہادت (کا نصاب) ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آجائے اور وہ وصیّت کر رہا ہو' تو تم میں سے دو معتبر اشخاص (بطور گواہ) موجود ہوں''

یعنی موت سے قبل وصیت کے وقت اپنے لوگوں میں سے دو گواہ (مرد) مقرر کر لو۔ واضح رہے کہ وصیت کُل ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ کی نہیں ہوسکتی۔ اگر جائیداد زیادہ ہے تو اس کا ایک تہائی حصہ بھی خاصا زیادہ ہوسکتا ہے۔

﴿اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ﴾ ''یا دوسرے دو آدمی تمہارے غیروں میں سے اگر تم زمین میں سفر پر (نکلے ہوئے) ہو اور (حالت سفر میں) تمہیں موت کی مصیبت پیش آجائے۔''

یعنی حالتِ سفر میں اگر کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں گواہان غیر قوم' کسی دوسری بستی' کسی دوسری برادری اور دوسرے قبیلے سے بھی مقرر کیے جاسکتے ہیں' مگر عام حالات میں اپنی بستی' اپنے خاندان میں رہتے ہوئے کوئی شخص انتقال کر

رہا ہے تو اسے وصیّت کے وقت اپنے لوگوں‘ رشتہ داروں اور قرابت داروں میں سے ہی دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنانا چاہیے۔

﴿تَحۡبِسُوۡنَهُمَا مِنۡۢ بَعۡدِ الصَّلٰوةِ﴾ ”تم ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد (مسجد میں) روک لو“

یعنی جب وصیت کے بارے میں متعلقہ لوگ پوچھیں اور اس میں کچھ شک کا احتمال ہو تو نماز کے بعد ان دونوں گواہوں کو مسجد میں روک لیا جائے۔

﴿فَيُقۡسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ﴾ ”پھر وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں اگر تمہیں شک ہو“

اگر تمہیں ان کے بارے میں کوئی شک ہو کہ کہیں یہ وصیّت کو بدل نہ دیں‘ کہیں ان سے غلطی نہ ہو جائے تو تم ان سے قسم اٹھوالو۔ وہ نماز کے بعد مسجد میں حلف کی بنیاد پر شہادت دیں‘ اور اس طرح کہیں:

﴿لَا نَشۡتَرِىۡ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰى﴾ ”ہم اس کی کوئی قیمت وصول نہیں کریں گے‘ اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو“

یعنی ہم اس شہادت سے نہ تو خود کوئی ناجائز فائدہ اٹھائیں گے‘ نہ کسی کے حق میں کوئی ناانصافی کریں گے اور نہ ہی کسی رشتہ دار عزیز کو کوئی ناجائز فائدہ پہنچائیں گے۔

﴿وَلَا نَكۡتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ﴾ ”اور نہ ہم چھپائیں گے اللہ کی گواہی کو“

غور کریں گواہی اتنی عظیم شے ہے کہ اسے شَهَادَةَ اللّٰهِ کہا گیا ہے‘ یعنی اللہ کی گواہی‘ اللہ کی طرف سے امانت۔

﴿اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الۡاٰثِمِيۡنَ ۝﴾ ”اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم گنہگاروں میں شمار ہوں گے۔“

آیت ۱۰۷ ﴿فَاِنۡ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسۡتَحَقَّاۤ اِثۡمًا﴾ ”پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ کمایا ہے“

حلفیہ بیان بھی غلط دیا ہے اور وصیّت میں ترمیم کی ہے‘ اس کے باوجود کہ نماز کے بعد مسجد کے اندر حلف اٹھا کر بات کر رہے ہیں۔ آخر انسان ہیں اور ہر معاشرے میں ہر طرح کے انسان ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

﴿فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا﴾ ''تو اب دو اور لوگ ان کی جگہ پر کھڑے ہوں''

﴿مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ ﴾ ''ان لوگوں میں سے جن کی حق تلفی کی ہے ان پہلے دو لوگوں نے''

اب وہ کھڑے ہو کر کہیں گے کہ یہ لوگ ہمارا حق تلف کر رہے ہیں' انہوں نے وصیت کے اندر خیانت کی ہے۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا﴾ ''پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی زیادہ برحق ہے ان دونوں کی گواہی سے''

﴿وَمَا اعْتَدَيْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۰۷﴾﴾ ''اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے' اگر ایسا ہو تو یقیناً ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ﴾ ''یہ طریقہ کار قریب تر ہے کہ اس سے لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت پیش کریں''

﴿اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ ''یا (کم از کم) انہیں خوف رہے کہ ہماری قسمیں ان کی قسموں کے بعد ردّ کر دی جائیں گی۔''

کیونکہ انہیں معلوم ہوگا کہ اگر ہم نے جھوٹی قسم کھا بھی لی' اور پھر اگر دوسرا فریق بھی قسم کھا گیا' تو ہمارا منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ اس کی ہمت نہیں کریں گے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سن رکھو۔''

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴿۱۰۸﴾﴾ ''اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اسی طرح کا معاملہ سورۃ النور (آیات ٦ تا ٩) میں بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھے اور اس کے پاس کوئی اور گواہ نہ ہو تو وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ تو اُس ایک شخص کی گواہی چار گواہوں کے برابر ہو جائے گی۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی بتایا ہے' کہ اگر بیوی بھی چار مرتبہ قسم کھا کر کہہ دے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے' مجھ پر تہمت لگا رہا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر اس کا الزام درست ہو' تو شوہر کی گواہی ساقط ہو جائے گی۔ اس طرح دونوں طرف سے اللہ تعالیٰ نے معاملے کو متوازن کیا ہے۔

اب آخری دو رکوع اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے مکالمے کا نقشہ کھینچا گیا ہے' جو قیامت کے دن ہوگا۔ اور اس کے پس منظر میں گویا ایک پوری داستان ہے' جو ایک نئی شان سے سامنے آئی ہے۔

آیات ۱۰۹ تا ۱۱۵

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى
وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ
وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ
كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ
وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا
وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ
يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ
صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً
مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ
يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۵ ۷ ۵

آیت ۱۰۹ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ﴾ ’’(اُس دن کا تصور کرو) جس دن اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور پوچھے گا آپ لوگوں کو کیا جواب

ملا تھا؟"

آپ لوگوں کی دعوت کے جواب میں آپ کی قوموں نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا؟

﴿قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾﴾ "وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں' تو ہی بہتر جاننے والا ہے غیب کی باتوں کا۔"

وہ اللہ تعالیٰ کے جناب میں زبان کھولنے سے گریز کریں گے اور کہیں گے کہ تو تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے' ہر حقیقت تجھ پر منکشف ہے۔

آیت ۱۱۰ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ "جب کہے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰؑ ابن مریمؑ"

اب روزِ قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خاص پیشی کا منظر ہے۔ دنیا میں ان کی پرستش کی گئی' ان کو اللہ کا بیٹا بنایا گیا' ثالثُ ثلاثۃ قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب آنجنابؑ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جو شرمندگی اٹھانا پڑے گی' اس کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے جب اللہ ان کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ اے عیسیٰؑ ابن مریم:

﴿اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ﴾ "ذرا میرے ان انعامات کو یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوئے۔"

﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ "جبکہ میں نے تمہاری مدد کی روح القدس سے"

جبرائیلؑ کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔

﴿تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ﴾ "تم گفتگو کرتے تھے لوگوں کے ساتھ پنگھوڑے میں بھی اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی۔"

تم شیر خوارگی کی عمر میں بھی لوگوں سے گفتگو کرتے تھے اور اوھیڑ عمر کو پہنچ کر بھی۔ آگے وہی سورۂ آل عمران (آیت ۴۸) والے الفاظ دہرائے جا رہے ہیں۔

﴿وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ﴾ "اور (یاد کرو میرے اس احسان کو) جب کہ میں نے تمہیں سکھائی کتاب اور حکمت' یعنی تورات اور انجیل۔"

درمیان کا واؤ تفسیریہ ہے' لہٰذا "یعنی" کے مفہوم میں آئے گا۔

﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ﴾ "اور (یاد کرو) جب تم بناتے

تھے گارے سے پرندے کی ایک شکل' میرے حکم سے''

﴿فَتَنۡفُخُ فِيۡهَا فَتَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِىۡ﴾ ''پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ ایک اُڑنے والا پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے''

﴿وَتُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِىۡ﴾ ''اور تم اچھا کر دیتے تھے مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے۔''

﴿وَاِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِىۡ﴾ ''اور جب تم مُردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے۔''

﴿وَاِذۡ كَفَفۡتُ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَنۡكَ﴾ ''اور (یاد کرو میرے اس احسان کو بھی) جب میں نے بنی اسرائیل کے ہاتھ روک دیے تم سے''

ان کے ہاتھ تم تک نہیں پہنچنے دیے اور تمہیں ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ یہ اُسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام گرفتار نہیں ہوئے' اور عین اُس وقت جب پولیس والے آپؑ کو گرفتار کرنے کے لیے باغ میں داخل ہوئے تو چار فرشتے اترے' جو آپؑ کو لے کر آسمان پر چلے گئے۔

﴿اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ﴿۱۱۰﴾﴾ ''جب کہ تم آئے ان کے پاس کھلے معجزات کے ساتھ تو کہا ان لوگوں نے جو ان میں سے کافر تھے کہ یہ تو صریح جادو کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

آیت ۱۱۱ ﴿وَاِذۡ اَوۡحَيۡتُ اِلَى الۡحَوَارِيّٖنَ﴾ ''اور (یاد کرو میرے احسان کو) جب میں نے اشارہ کیا حواریوں کو''

﴿اَنۡ اٰمِنُوۡا بِىۡ وَبِرَسُوۡلِىۡ﴾ ''کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔''

ان کے دل میں ڈال دیا' الہام کر دیا' ان کی طرف وحی کر دی۔ یہ وحیٔ خفی ہے۔ ظاہر ہے حواریوں کی طرف وحی جلی تو نہیں آ سکتی تھی جو خاصۂ نبوت ہے۔ لیکن جیسا کہ شہد کی مکھی کے لیے وحی کا لفظ آیا ہے (النحل: ۶۸) یا جیسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو وحی کی (فُصلت: ۱۲) یہ وحیٔ خفی کی مثالیں ہیں۔

﴿قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَاشۡهَدۡ بِاَنَّنَا مُسۡلِمُوۡنَ﴿۱۱۱﴾﴾ ''تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے

اور (اے عیسیٰؑ آپ بھی) گواہ رہیے کہ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔"

آیت ۱۱۲ ﴿اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ "اور (ذرا یاد کرو اس واقعے کو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم"

﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ﴾ "کیا آپ کے رب کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان اتارے؟

﴿قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ "(جواب میں عیسیٰؑ نے) کہا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔"

مؤمنین کو ایسی دعائیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایسے مطالبات آپ لوگوں کو زیب نہیں دیتے۔

آیت ۱۱۳ ﴿قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا﴾ "انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس (خوان) میں سے کھائیں اور ہمارے دل بالکل مطمئن ہو جائیں"

یہ اس طرح کی بات ہے جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ﴾ (البقرہ: ۲۶۰)۔ اسی طرح کا مشاہدہ وہ بھی طلب کر رہے تھے۔

﴿وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ "اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپؑ نے جو کچھ ہم سے کہا وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ بن جائیں۔"

تاکہ ہمیں آپؑ کی کسی بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور ایسا یقینِ کامل ہو جائے کہ پھر ہم جب آپؑ کی جانب سے لوگوں کو تبلیغ کریں تو ہمارے اپنے دلوں میں کہیں شک وشبہ کا کوئی کانٹا چبھا ہوا نہ رہ جائے۔

آیت ۱۱۴ ﴿قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ "اس پر عیسیٰؑ ابنِ مریم نے دعا کی: اے اللہ! اے ہمارے رب! اتار دے ہم پر ایک دستر خوان آسمان سے"

﴿تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ﴾ "جو عید بن جائے ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور ایک نشانی ہو تیری طرف سے۔"

آسمان سے خاص تیرے ہاں سے کھانے سے بھرے ہوئے دستر خوان کا نازل ہونا یقیناً ہمارے لیے جشن کا موقع ہوگا' ہمارے اگلوں پچھلوں کے لیے ایک یادگار واقعہ اور تیری طرف

سے ایک خاص نشانی ہوگا۔

﴿وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ ''اور ہمیں رزق عطا فرما اور یقیناً تُو بہترین رزق دینے والا ہے۔''

آیت ۱۱۵ ﴿قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ﴾ ''اللہ نے ارشاد فرمایا (ٹھیک ہے) میں نازل کردوں گا اس کو تم پر۔''

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''لیکن پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کفر کی روش اختیار کرے گا تو پھر اس کو میں عذاب بھی وہ دوں گا جو تمام جہانوں میں سے کسی اور کو نہیں دوں گا۔''

یعنی جب اس طرح کی کوئی خرقِ عادت چیز دکھا دی جائے گی' کھلا معجزہ سامنے آ جائے گا تو پھر رعایت نہیں ہوگی۔ گزشتہ قوموں کے ساتھ ایسے ہی ہوا تھا۔ قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ابھی اس چٹان میں سے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہو جانی چاہیے۔ وہ اونٹنی برآمد ہوگئی' لیکن ساتھ ہی رعایت بھی ختم ہوگئی۔ ان سے واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ اب تمہارے لیے مہلت کے صرف چند دن ہیں' اگر ان دنوں میں ایمان نہیں لاؤ گے تو نیست و نابود کر دیے جاؤ گے۔ یہ بات سورۃ الشعراء میں بہت تفصیل سے آئے گی کہ اے نبیؐ یہ لوگ اب جو نشانیاں مانگ رہے ہیں تو ہم یہ ان کی خیر خواہی میں انہیں نہیں دکھا رہے ہیں۔ اگر ان کے کہنے پر ایسی نشانیاں ہم دکھا دیں تو پھر ان کو مزید رعایت نہیں دی جائے گی اور ان کی مہلت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس قسم کے معجزے دیکھ کر نہ کوئی پہلے ایمان لایا' نہ اب یہ لوگ لائیں گے۔ ان کے اندر جو نیت کا فساد ہے وہ کہاں انہیں ماننے دے گا؟ جیسے قومِ صالحؑ نے نہیں مانا' حالانکہ اپنی نگاہوں کے سامنے انہوں نے ایسا کھلا معجزہ دیکھ لیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو یہودیوں نے نہیں مانا' اُلٹا انہیں جادو قرار دے دیا۔ تو اس قدر واضح معجزات دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہیں لائے۔ سوائے ان جادوگروں کے جن کا فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تھا۔ نہ تو خود فرعون ایمان لایا تھا نہ فرعون کے درباری اور نہ ہی عوام الناس۔ چنانچہ معجزے کا ظہور دراصل متعلقہ قوم کے خلاف جاتا ہے۔ معجزے کے ظہور سے پہلے تو اُمید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ شاید اس قوم کو کچھ ڈھیل دے دے' شاید کچھ اور لوگوں کو ایمان کی توفیق مل جائے' لیکن معجزے کے ظہور سے مہلت کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ
اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ
بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ
نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ
اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا
تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ
تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝
قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ع

اب یہ اس پیشی کا آخری منظر ہے اور اس کا انداز بہت سخت ہے۔

آیت ۱۱۶ ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور جب اللہ کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں دونوں کو معبود بنا لینا' اللہ کے سوا؟''

﴿قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ﴾ ''وہ (جواب میں) عرض کریں گے (اے اللہ) تُو پاک ہے' میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔''

﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ﴾ ''اگر میں نے وہ بات کہی ہوتی تو وہ تیرے علم میں ہوتی۔''

﴿تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝﴾

''تُو تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ یقیناً تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔''

آیت ۱۱۷ ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ﴾ ''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی کچھ جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا''

﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ ۚ﴾ ''(اور وہ یہی بات تھی) کہ بندگی کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے۔''

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ﴾ ''اور میں ان پر نگران رہا جب تک اُن میں موجود رہا۔''

ان کی دیکھ بھال کرتا رہا' نگرانی کرتا رہا۔ یہاں لفظ ''شہید'' نگران کے معنوں میں آیا ہے۔

﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''پھر جب تُو نے مجھے اٹھالیا تو (اس کے بعد) تُو ہی نگران تھا ان پر''

واضح رہے کہ یہاں بھی تَوَفَّيْتَنِىْ موت کے معنوں میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ آل عمران آیت ۵۵ (اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ) کی تشریح مدنظر رہے۔

﴿وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١١٧﴾﴾ ''اور یقیناً تُو ہر چیز پر گواہ ہے۔''

تُو ہر چیز پر نگران ہے' ہر چیز سے باخبر ہے۔

آیت ۱۱۸ ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ﴾ ''اب اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔''

تجھے ان پر پورا اختیار حاصل ہے' تیری مخلوق ہیں۔

﴿وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١١٨﴾﴾ ''اور اگر تو انہیں بخش دے تو تُو زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

یہ بہترین انداز ہے۔ معافی کی درخواست بھی ہے' جس میں بہت خوبصورت انداز میں شفقت و رأفت کا اظہار ہے' جو نوعِ انسانی کے لیے انبیاء کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ مقامِ عبدیت یہی ہے۔ تو اے اللہ! تیرا ہی اختیار ہے اور تو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ اگر تو انہیں معاف فرمانا چاہے تو تجھ سے کوئی باز پُرس نہیں کر

سکتا' کوئی جواب طلبی نہیں کر سکتا کہ تو نے کیسے معاف کر دیا! اب آ رہا ہے کہ اس پوری پیشی کا ڈراپ سین اور آخری نقشہ کیا ہوگا۔

آیت ۱۱۹ ﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ﴾ ''اللہ فرمائے گا یہ آج کا دن وہ ہے جس دن سچوں کو ان کی سچائی فائدہ پہنچائے گی۔''

ان کا سچ اور صدق ان کے حق میں مفید ہوگا۔

﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ﴾ ''ان کے لیے باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

یہ ہے باہمی رضامندی کا آخری مقام' اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔

آیت ۱۲۰ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ﴾ ''اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے' سب کی بادشاہی۔''

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے سورۃ المائدۃ کے اختتام کے ساتھ ہی مکی اور مدنی سورتوں کے گروپس (groups) میں سے پہلا گروپ ختم ہو گیا ہے' جس میں ایک مکی سورۃ یعنی سورۃ الفاتحہ اور چار مدنی سورتیں ہیں۔ سورۃ الفاتحہ اگرچہ حجم میں بہت چھوٹی ہے لیکن یہ اپنی معنوی عظمت کے لحاظ سے پورے قرآن کے ہم وزن ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾﴾ مفسرین کی رائے کے مطابق سورۃ الفاتحہ ہی کے بارے میں ہے۔ اس گروپ کی چار مدنی سورتیں البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ دو دو کے جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان تمام سورتوں کے مضامین کا عمود ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کر لیں۔ تکمیل شریعتِ آسمانی' اہلِ کتاب سے خطاب اور ردّ وقدح' ان پر الزامات کا تذکرہ' ان کے غلط عقائد کی نفی' انہیں ایمان کی دعوت' ان کی تاریخ کے اہم واقعات کی تفصیلات' ان کا اُمتِ مسلمہ کے منصب سے معزول کیا جانا' جس پر وہ دو ہزار برس سے فائز تھے اور اُمتِ محمد ﷺ کا اس منصب پر فائز کیا جانا۔ یہ موضوعات آخری درجے میں اس گروپ کی سورتوں میں مکمل ہو گئے ہیں۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم' ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم○○

اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ (یوسف:۴۰)

وَّلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (الکہف)

وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ (بنی اسراءیل:۱۱۱)

وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ (البقرۃ:۳۰)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱﴾ (الحجرات)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾ (النساء)

یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ؕ
(آل عمران:۱۵۴)

وَالَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَاَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿ۚ۳۸﴾ (الشوریٰ)

تمہیدی کلمات

''اسلام کے نظامِ حیات'' کے موضوع پر سلسلہ وار خطابات کے ضمن میں آج چوتھا خطاب ہے' جس کا عنوان ہے: ''اسلام کا سیاسی اور ریاستی نظام''۔ اس سے پہلے اس سلسلہ کے تین خطابات ہو چکے ہیں: (i) ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان'' (ii) ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' (iii) ''اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام'' —— آج کے موضوع پر اظہارِ خیال سے پہلے میں ایک بار پھر یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے نظام حیات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ ''نظامِ حیات'' ہی نہیں بلکہ ''نظام'' کی اصطلاح بھی ایک جدید اور حادث اصطلاح ہے' یہ قرآن و سنت کی اصطلاح نہیں ہے اور ''نظام'' کا لفظ قرآن و حدیث دونوں میں نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیمات یقیناً انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہیں اور قدیم ہیں لیکن جہاں تک اس اصطلاح (نظام' نظامِ حیات) کا تعلق ہے تو یہ قدیم نہیں' بلکہ ایک جدید اصطلاح ہے' جو کچھ ہی عرصہ قبل استعمال ہونی شروع ہوئی ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ اصطلاح سب سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے استعمال کی ہے جنہوں نے ایک نعرہ لگایا تھا کہ ''فَكٌّ كُلِّ نظامٍ''۔

دوسری بات اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہمیں دیا ہے وہ اوامر و نواہی اور احکامِ شریعت ہیں اور اصل اہمیت' دوام اور استقلال ان احکام ہی کو حاصل ہے۔ فقہاء کرامؒ ان احکام کی درجہ بندی کرتے ہیں کہ کیا فرض ہے' کیا واجب ہے' کیا سنت ہے' کیا مستحب ہے' اور دوسری طرف کیا مکروہ ہے اور پھر مکروہ کی مزید تقسیم کہ کیا مکروہ تنزیہی ہے' کیا مکروہ تحریمی ہے اور کیا حرامِ مطلق ہے۔ اس درجہ بندی کے لیے بڑے گہرے فہم اور تفقہ فی الدین کی ضرورت ہے اور ہمارے ائمہ نے اس میں انتہائی محنت' لیاقت' مہارت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ درحقیقت دین میں اصل اہمیت ان ہی احکام کی ہے۔ ہم ان احکام کو جوڑ کر مربوط کر کے اپنے فہم اور سمجھ کے مطابق ایک ''نظام'' بناتے ہیں۔ مثلاً وہ احکام اور اوامر و نواہی جو معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں' انہیں ہم جمع کر کے کہیں گے کہ یہ اسلام کا معاشرتی نظام ہے۔ اسی طرح وہ احکام اور قواعد جو مالی امور سے متعلق ہیں' ان کو جمع کر کے ہم اسے اسلام کا معاشی نظام قرار دیں گے۔ اس طرح مختلف احکام کی حکمت اور باہم مناسبت کو سمجھتے ہوئے' انہیں ترتیب دے کر ایک نظام کی شکل میں مرتب کرنے میں کوئی حرج اور قباحت نہیں ہے'

البتہ ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ جو احکام میں ربط اور ترتیب قائم کی گئی ہے وہ ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے اس لیے اس میں خطا کا امکان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شے جو اہم تر تھی ہم نے اسے کم اہم سمجھ لیا ہو اور کوئی چیز جو ثانوی درجے کی تھی اس کو اولیت دے دی ہو۔ پھر یہ کہ اس ترتیب میں ہماری سوچ' ہماری ترجیحات' ہمارا ذوق وشوق اور ہمارا امزاج لازماً اثر انداز ہوا ہے اور اس حوالے سے بھی اس میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ چنانچہ جو کوئی بھی ان احکام کو جوڑ کر ایک نظام کی شکل دے گا اِس میں اُس کے ذاتی اجتہاد کا بھی دخل ہوگا۔ اس کے لیے ہمارے ذہن کھلے رہنے چاہئیں اور اسی سے تمدنی اور عمرانی ارتقا کی راہیں کھلتی ہیں۔

انسانی اجتماعیت کی مختلف سطحیں

انسانی اجتماعیت کی مختلف سطحیں (stages) ہیں' جن کی ترتیب تاریخی اعتبار سے بھی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے بھی۔ اس حوالے سے میں اشارتاً عرض کردوں کہ میرے نزدیک انسانی اجتماعیت کی چار سطحیں ہیں۔ انسانی اجتماعیت کی بنیاد اور پہلی سطح ''عائلی نظام'' ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے۔ جب خاندان کا یہ سلسلہ وسیع ہوتا ہے تو اس سے معاشرہ اور ''معاشرتی نظام'' وجود میں آتا ہے' جو اجتماعیت کی دوسری سطح ہے۔ پھر یہ معاشرہ جب انتظامی سطح پر پہنچتا ہے اور زیادہ منظم ہو جاتا ہے تو یہ منظم معاشرہ ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر اس سے ''سیاسی نظام'' وجود میں آتا ہے' جو ہمارا آج کا موضوع ہے اور یہ اجتماعیت کی تیسری سطح ہے۔ اسی طرح ایک منظم معاشرے میں معاشی معاملات بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور انسانی معیشت کا معاملہ بھی ایک قدیم معاملہ ہے' اسی سے ''معاشی نظام'' وجود میں آتا ہے جو اجتماعیت کی چوتھی سطح ہے۔ اس معاملے میں تمدنی ارتقاء اور صنعتی انقلاب کے بعد جو تبدیلیاں اور نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں اس اعتبار سے معاشی امور میں اجتہاد کی بہت ضرورت ہے۔

انسانی اجتماعیت کی ان چار سطحوں میں سے جو پہلی سطح ہے' ان میں جو پہلی سطح ہے قرآن مجید میں سب سے زیادہ تفصیلی احکام اسی کے بارے میں آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرت اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسان قدیم ہے۔ مرد اور عورت کے حقوق وفرائض کے توازن کے حوالے سے میں نے گزشتہ خطاب میں جو مسئلہ بیان کیا' وہ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مسئلہ ہے' جو آدم وحوا کی پیدائش اور نسلِ انسانی کے آغاز سے ہی وجود میں آ گیا تھا اور نزولِ

قرآن کے بعد بھی اس مسئلے میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی —— وہی عورت ہے اور وہی اس کی نفسیات اور وہی مرد ہے اور وہی اس کی نفسیات۔

اسلام نے اجتماعیت کی ان سطحوں میں سے پہلی سطح یعنی معاشرتی وسماجی نظام کے بارے میں گویا مکمل قانون دیا ہے اور جتنی مفصل بحثیں قرآن میں اس موضوع کے عملی معاملات سے متعلق آئی ہیں' کسی اور موضوع سے متعلق نہیں آئیں۔ تفصیلی احکام ہمیں اسی میدان میں ملتے ہیں کہ معاشرتی اقدار (social values) میں سے کون سی اقدار کو فروغ دیا جانا چاہیے اور کون سی اقدار ایسی ہیں جن کا استیصال مطلوب ہے۔ اسی طرح سماجی برائیوں (social evils) کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ اس کے برعکس قرآن میں معاشی نظام کے بارے میں صرف چند گنے چنے احکام بیان ہوئے ہیں' البتہ کچھ بہت اہم اصول دیے گئے ہیں کہ ان کے امتزاج سے اور پھر اس میں اجتہادی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان پیش قدمی کر سکتا ہے۔

جہاں تک سیاسی اور ریاستی نظام کا تعلق ہے اس ضمن میں تو میرے نزدیک قرآن میں حکم کوئی بھی نہیں آیا' کوئی ڈھانچہ سرے سے دیا ہی نہیں گیا' صرف اصول دیے گئے ہیں۔ قرآن و سنت میں غور و فکر کرنے سے آپ کو اسلامی ریاست کے صرف بنیادی اصول ملیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت اس میدان میں ارتقا کا عمل جاری تھا اور اس وقت تک انسان کا سیاسی شعور صرف حکومت کے تصور تک پہنچا تھا۔ ابھی یہ تصور وجود میں نہیں آیا تھا کہ حکومت صرف ایک انتظامی ادارہ ہے جبکہ اصل ادارہ ریاست (state) ہے—کسی ریاست کے شہریوں کی اصل وفاداری ریاست کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے ساتھ —— حکومت لوگوں کے منشا اور مرضی سے بنے گی بھی اور ٹوٹے گی بھی' لیکن اصل اہمیت' استحکام اور دوام ریاست کو ہے جس کے ساتھ وفاداری شہریت کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ تصور اُس وقت تک نوعِ انسانی کے ذہن میں موجود نہیں تھا' اس لیے قرآن حکیم نے اس سطح پر صرف اصول دیے ہیں۔ اب ہمیں انہی اصولوں کی روشنی میں اسلام کے سیاسی اور ریاستی نظام کو سمجھنا ہے۔

موجودہ دور کے مسلم مفکرین

موجودہ دور کے مسلم مفکرین میں میں سب سے زیادہ علامہ اقبال کی صحتِ فکر اور جامعیتِ فکر کا قائل ہوں۔ ایک طرف تو انہوں نے بڑے غامض فلسفیانہ مسائل سے بحث کی جس کا تعلق اس سلسلۂ خطابات کے پہلے دو خطابات: ''اسلامی نظام کی نظریاتی اساس: ایمان''

اور ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' سے ہے۔ دوسری طرف علامہ اقبال نے اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ اور سیاسی و معاشرتی نظام کے بارے میں صحیح اور جامع ترین فکر دی۔ یعنی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال نے پوری ''مجدّدانہ'' شان کے ساتھ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی از سرِ نو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو عہد حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح اور حقوق انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے مغربی فکر کی گہرائی میں اُتر کر اس کا شعور و ادراک حاصل کر کے اس کی صحیح تشخیص کی اور اس میں صحیح اور غلط اجزاء علیحدہ علیحدہ کر کے اس کی تمییز کی۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے علامہ اقبال کو فکرِ اسلامی کے ''مجدّد'' کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ ان کی بعض آراء سے کسی کو اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ خود علامہ اقبال نے Reconstruction of Religious Thought in Islam کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حرفِ آخر ہے اور وہی حق ہے' بلکہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ پیش کیا ہے۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا طالب علمانہ رویہ برقرار رہے۔ ہوسکتا ہے کہ جیسے جیسے اس میدان میں کچھ کام کرنے والے لوگ آگے بڑھیں اس سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔'' (مفہوم) یہ ان کی طرف سے کسرِ نفسی کا اظہار ہے جو بجائے خود ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ البتہ میں ان لوگوں سے شدید اختلاف رکھتا ہوں جن کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی شخصیت سے عقیدت ہو تو اس کے بارے میں ایک غلو پیدا ہو جائے اور محبت و عقیدت اس درجے کو پہنچ جائے کہ اس کی کوئی خامی نظر نہ آئے' بلکہ خامیاں بھی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کوئی اختلاف ہو تو پھر اس کی کوئی خوبی' کوئی خیر نظر ہی نہ آئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ))[1] ''تمہارا کسی سے محبت کرنا تمہیں اندھا بہرا کر دیتا ہے''۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دورِ زوال میں ہمارے بزرگوں اور موجودہ دور کے فکری' عملی' دینی اور سیاسی رہنماؤں میں سے کسی نے اگر ہمارے دین کے کسی ایک گوشے میں بھی' مثلاً احیائے ملت' احیائے دین' احیائے فکر اسلامی' احیائے عمل' احیائے تصوف' احیائے احسان' میں کوئی خدمت کی ہے' کوئی کام کیا ہے تو اس کی عظمت کا اعتراف اور اقرار ہونا چاہیے' لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اندھے پیروکار بن جائیں اور اس کی کسی بات

(1) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الھوی۔

پر آپ کی ناقدانہ نگاہ نہ پڑے۔

تجدیدِ فکرِ اسلامی میں علامہ اقبال کے بعد دوسری اہم شخصیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ہے۔ میرے نزدیک اسلامی نظام حیات کے دو گوشوں یعنی معاشرتی اور سیاسی نظام کے بارے میں بنیادی فکر علامہ اقبال کے ہاں موجود ہے' لیکن اسے مولانا مودودیؒ نے جس خوبصورتی' سلاست' وضاحت اور منفرد اسلوبِ نگارش سے عام کیا ہے یہ ان کا بہت بڑا حصہ (contribution) ہے' بلکہ میں انہیں اس دور کا سب سے بڑا مسلم سیاسی مفکر سمجھتا ہوں۔ جدید اسلامی ریاست کا تصور اور اس کی فلسفیانہ اساس کے علاوہ اس جدید اسلامی ریاست کا ڈھانچہ (structure) کیا ہوگا' اس کی ہیئت تشکیلی کیا بنے گی' ان کے بارے میں جو وضاحت' تفصیل اور جامعیت مولانا مودودیؒ کے ہاں ملتی ہے اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ علامہ اقبال سے آگے ہیں۔

اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست

اس تمہید کے بعد اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اسلامی ریاست یا سیاسی نظام سے متعلق آج میں سات باتوں کے حوالے سے گفتگو کروں گا۔ ان میں سے سب سے پہلی بات اصل الاصول کا درجہ رکھتی ہے کہ اسلامی ریاست قومی ریاست نہیں' نظریاتی ریاست ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے' کیونکہ اس بات کو علامہ اقبال نے اشارات میں اور ان کے بعد مولانا مودودی اور دوسرے اہلِ قلم نے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اسلامی ریاست قومی ریاست نہیں بلکہ نظریاتی ریاست (Ideological State) ہے۔ اگرچہ یہ ریاست زمین پر قائم ہوگی اور اس کی حدود بھی ہوں گی اور ان حدود کی اسی طرح حفاظت بھی کی جائے گی جیسے ایک قومی ریاست اپنی سرحدوں کا دفاع کرتی ہے' لیکن وہ ان حدود پر مبنی نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے یہ بنیادی بات سمجھ لیجیے کہ اس ریاست کی اساس اور بنیاد ان حدود پر نہیں ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا فضل ہوا اور خالص اسلامی ریاست قائم ہوئی (یہ اللہ کا وعدہ ہے اور یہ ہو کر رہے گا' لیکن کب اور کہاں؟ یہ مختلف بات ہے) تو چونکہ یہ قومی ریاست نہیں ہوگی لہٰذا potentially اس کی حدود ہمیشہ وسعت پذیر ہوں گی۔ یہ حدود ایسی نہیں ہوں گی جو بس دائم و قائم اور ہمیشہ کے لیے اٹل ہوں' بلکہ جس طرح نظریے میں اگر توانائی اور قوت ہو تو وہ حدود و قیود سے بالکل ماورا

ہو کر پھیلتا ہے اسی طرح نظریاتی ریاست جو کسی نظریاتی انقلاب کی بنیاد پر قائم ہو' اس کی فطرت اور مزاج میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ کسی حدود پر قانع نہیں رہتی بلکہ وسعت پذیر ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست کی اگرچہ زمینی حدود ہوتی ہیں' لیکن اسلامی ریاست کی بنیاد کسی علاقے پر نہیں بلکہ ایک نظریے یعنی ایمان اور اسلام پر ہوتی ہے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اصولاً تو بنیاد ایمان ہے لیکن قانوناً اور دستوراً ایمان نہیں' اسلام بنیاد ہے۔ اس لیے کہ ایمان ایک مخفی حقیقت ہے جو قابلِ توثیق (verifiable) نہیں ہے۔ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں' کوئی منافق ہے' کوئی بہروپیا ہے' کوئی جاسوس بن کر آ گیا ہے (جیسے دو یہودی حضورﷺ کے جسدِ اطہر کو قبر شریف سے نکال کر لے جانے کے لیے آئے اور انہوں نے ایسا بہروپ اختیار کیا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا) ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں ہے کہ ہم کسی کے دل کا حال جان سکیں اور اس کے ایمان کی تصدیق و توثیق اور جانچ پڑتال کر سکیں۔ جبکہ ایک قانونی اور دستوری ڈھانچہ لازماً ایک ایسی اساس کا متقاضی ہے جو قابل تصدیق ہو' لہٰذا اصولاً تو اسلامی ریاست ایمان پر قائم ہے لیکن اس کی دستوری اور قانونی اساس ایمان نہیں اسلام ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ خالص اسلامی ریاست تو دورِ نبویﷺ اور دورِ خلافت راشدہ میں اپنی کامل اور تکمیلی شکل میں دنیا میں بالفعل قائم رہی ہے اور اس کے بعد سے زوال شروع ہوا۔ اگرچہ دورِ بنواُمیہ کو اس اعتبار سے ایک فضیلت حاصل ہے کہ اس میں اُمت کی ایک وحدت تھی' ایک ہی حکومت' ایک ہی ریاست اور ایک ہی نظام تھا' لیکن جیسے ہی دورِ بنواُمیہ ختم ہوا تو عالم اسلام دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف خلافتِ بنوعباس قائم ہو گئی اور دوسری طرف اسپین میں خلافت بنی امیہ جاری رہی۔ اس کے بعد تقسیم در تقسیم ہوتی گئی اور تقسیم کا یہ عمل جاری رہا' لیکن ایک بڑی اہم حقیقت سامنے رکھیے کہ اس پورے عرصے میں اور اس صدی کے آغاز تک مسلمانوں کی وحدتِ ملی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ حکومتیں جدا تھیں لیکن ریاست ایک ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان اس عالمی ریاست بلکہ صحیح تر الفاظ میں آفاقی اسلامی ریاست کا شہری تھا اور اسے کہیں بھی کسی پاسپورٹ یا ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک شخص مراکش سے چل کر ہندوستان آ پہنچتا ہے اور یہاں وہ وزیر بن جاتا ہے' اسے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہاری قومیت کیا ہے' تمہاری نسلیت کیا ہے' تم زبان کون سی بولتے ہو' یہاں آئے کیسے ہو' داخل کیسے ہوئے ہو؟ مسلمان چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا وہ اس آفاقی

اسلامی ریاست کا شہری تھا' البتہ حکومتیں اور انتظامی یونٹ الگ تھے۔ ان جداگانہ انتظامی یونٹس کے باوجود مسلمانوں کی وحدتِ ملی اس صدی کے آغاز تک برقرار رہی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جو سب سے کاری وار عالم اسلام اور ملت اسلامیہ پر مغربی استعمار (imperialism) نے کیا وہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کے تصور کو پاش پاش کر دیا اور قومیتوں کے تصور کو عام کیا۔ پہلے قوموں اور پھر قومیتوں کی تقسیم در تقسیم کا عمل جو اس صدی میں دوسری دہائی کے بعد سے چلنا شروع ہوا ہے' وہ ابھی جاری ہے اور اگر اس میں کوئی انقلابی تبدیلی نہ آئی تو نمعلوم ابھی اور کیا شکلیں اختیار کرے گا۔

قومی ریاست (Nation State) کا تصور ایک جدید تصور ہے اور ہمارے جن علمائے کرام نے جدید نظریات اور جدید تصورات کا مطالعہ نہیں کیا' وہ سمجھ نہیں پائے کہ اس میں کتنا کچھ زہر گھلا ہوا ہے اور یہ تصور بنیادی طور پر اسلام کی جڑوں پر کس طرح تیشہ بن کر گر رہا ہے۔ اس کا صحیح صحیح ادراک اور شعور صرف علامہ اقبال کو ہوا اور انہوں نے اسلامیانِ ہند کو متنبہ کیا کہ ؎

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
فرمانِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے!

ان دونوں کے لفظی اشتراک کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ' یہ تو تہذیبِ جدید کا نو تراشیدہ بُت ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے جذبات کی شدت اس وجہ سے ہے کہ وہ خود مغرب میں گئے اور انہوں نے مغرب کے فکر اور فلسفہ کا براہِ راست مطالعہ ہی نہیں' مشاہدہ بھی کیا۔ ان کا اپنے بارے میں کہنا ہے ع ''کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!'' واقعہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے آگ کے اس الاؤ کے اندر گئے ہیں اور وہاں جا کر انہوں نے اس کی شدّت و حدّت کا مشاہدہ کیا ہے۔ تو مغربی فکر و فلسفہ میں جو زہر گھلا ہوا ہے اس کو جتنا وہ سمجھ سکے ہیں' وہ ان لوگوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا جنہوں نے سرے سے مغربی فکر کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ ان کا خلوص و اخلاص اور دین کا علم اپنی جگہ قابل قدر ہے' لیکن جدید گمراہ کن تصورات کی صحیح طور پر جانچ پڑتال (evaluation) کہ یہ کس جگہ ہمارے دین اور ہمارے جسد ملی پر زخم لگا رہے ہیں' اس کی اپنی ایک جداگانہ حیثیت ہے اور اس کے تقاضے بھی مختلف ہیں جن کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ علامہ اقبال کی نظم ''وطنیت'' (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) اس ضمن

میں حرفِ آخر ہے:ـ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

میں جب بھی یہ اشعار پڑھتا ہوں' مجھے غالب کا یہ شعر بھی یاد آ جاتا ہے:ـ

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا!

اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ کیجیے ـ

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے!

چنانچہ اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے پہلی بات یہ نوٹ کر لیں کہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی بنیاد اصولاً ایمان اور دستوراً و قانوناً اسلام پر ہے۔ میں نے اپنے گزشتہ خطاب میں یہ عرض کیا تھا کہ اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ ہے جس میں فرق و امتیاز رنگ و نسل' زبان اور علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک نظریے یعنی ایمان اور اسلام کی بنیاد پر ہوگا۔ اسلامی معاشرے میں غیر مسلم ثانوی حیثیت سے شریک ہیں' وہ اس معاشرے کا اصلاً جزو نہیں ہیں۔ ان میں سے جو غیر متحارب ہیں ان کے ساتھ بھلائی اور تالیف قلب کا معاملہ کرنا جائز ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ⑧﴾ (الممتحنة)

''اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو تم سے تمہارے دین کے بارے میں لڑتے نہیں

ہیں اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں' کہ تم ان سے نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

لیکن ان سے دوستی' مودت اور محبت قلبی نہیں ہوسکتی' اس لیے کہ اس کا دائرہ محدود ہے:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾﴾ (المائدۃ)

''تمہارے ولی تو اصل میں اللہ' اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں' جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں جھک کر۔''

یہ ہے ہماری ولایت قلبی کا دائرہ —— اس اعتبار سے ہمارا معاشرہ مخلوط معاشرہ نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ ہے۔ اس پر گزشتہ خطاب میں قرآن و حدیث سے حوالے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ

اسلام کے سیاسی نظام کے ضمن میں دوسری بحث یہ ہے کہ حاکمیت (sovereignty) کس کی ہے' اقتدارِ اعلیٰ کا مالک کون ہے؟ اور قانون کی تشکیل' اس کی تشریح اور اس کی تنفیذ کس کے ذریعے ہوگی؟ اس میں بھی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ الحمدللہ! یہ باتیں بہت عام ہیں کہ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ میں نے خطاب کے آغاز میں آیاتِ قرآنیہ کے تین ٹکڑے پڑھے تھے: (i) ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۴۰) ''حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے''۔ (ii) ﴿وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ (الکہف) ''وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ (iii) ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۱) ''حاکمیت میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے''۔ ایک لفظ ہے حکومت یا حاکم' یہ مجازاً استعمال ہوتا ہے' لیکن حاکم مطلق وہ ذات ہے جس کے پاس قانون بنانے' اس کی تشریح اور اس کی تنفیذ کا مکمل اختیار ہو۔ اسلامی ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ کا حق صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے۔ یہ بات بھی علامہ اقبال نے کس قدر سادگی اور سلاست کے ساتھ بیان کی ہے: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

یہاں بھی علامہ اقبال نے لفظ بُت استعمال کیا ہے۔ ایک تو قومیت کا بُت اور دوسرا غیر اللہ کی

حاکمیت کا بُت۔ یعنی حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کرنا کفر وشرک ہے۔

ایک دور میں ہمارے بعض دانشوروں نے اس حوالے سے ایک بحث چھیڑی تھی کہ حاکمیت تو عوام ہی کے پاس ہوتی ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختیار دیا ہے۔ نظری اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ اللہ نے انسان کو اختیار (choice) دیا ہے: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③﴾ (الدھر) ''ہم نے اس کو راہ دکھلائی (یہ جانچنے کے لیے) کہ یہ شکر کرتا ہے یا ناشکری''۔ یہ اختیار تو گویا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کا جزو لاینفک ہے کہ یہ دنیا کی زندگی امتحان گاہ ہے۔ اب اگر اختیار نہ ہو' کوئی choice نہ ہو تو پھر امتحان کیسا؟ لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ یہ اختیار چاہے اِدھر استعمال ہو جائے چاہے اُدھر' نتیجہ برابر نکلے گا۔ نتیجے میں تو زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ سورۃ الدھر میں ہی فرمایا: ﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤﴾ ''ہم نے تیار کر دی ہے منکروں کے واسطے زنجیریں' طوق اور دہکتی آگ۔ البتہ نیک لوگ ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی''۔ اگر آپ اللہ کے ودیعت کردہ اختیار کو اپنے ہی اختیار سے اللہ کے قدموں میں ڈال دیں کہ اے پروردگار تو نے ہی مجھے اختیار دیا تھا' میں اس اختیار سے دستبردار ہوتا ہوں' میں اپنے اس اختیار کو تیرے قدموں میں ڈالتا ہوں' تو یہ اسلام ہے۔ یہ تو تھا فرد کا معاملہ' پھر یہی معاملہ ہوگا اجتماعی سطح پر۔ مسلمان قوم اور اسلامی ریاست حقیقت میں وہ ہوگی جو اللہ کی طرف سے عطا کردہ اس اختیار کو اپنے ایک اجتماعی فیصلے کے تحت اللہ ہی کے قدموں میں ڈال دے۔ یہی وہ کام ہے جو ہمارے ہاں ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے ہوا اور یہ تسلیم کیا گیا کہ یہ اختیار اللہ کی طرف سے دی ہوئی ایک امانت ہے' اور چونکہ حاکمیتِ مطلقہ اس کی ہے اس لیے ہم اس اختیار کو اُس کی عائد کردہ حدود کے اندر استعمال کریں گے۔ گویا ہم نے بالفعل تسلیم کر لیا کہ حاکمیتِ مطلقہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔

حاکمیتِ الٰہیہ کا منطقی نتیجہ: خلافت

اللہ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کر لینے کا جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے اس کے لیے قرآن مجید میں ''خلافت'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ خلافت ہے۔ بعض لوگوں کا طرزِ عمل ایسا ہوتا ہے کہ وہ نئے علمی نکات پیدا کرنے کا خاص ذوق رکھتے ہیں اور خواہ مخواہ کے مباحث اٹھاتے رہتے ہیں۔ مثلاً یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ اللہ کا خلیفہ نہیں ہوسکتا' کیونکہ

اللہ تو زندہ ﴿الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ہے اور ہر جگہ موجود ہے' خلیفہ تو اُس کا ہوتا ہے جو فوت ہو گیا ہو اور جو کہیں غائب ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس لفظ کا یہ استعمال بھی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر جا رہے تھے تو اپنے بھائی کو خلیفہ بنا گئے تھے کہ تم میری خلافت کا حق ادا کرو' میرے فرائض اور ذمہ داری ادا کرو: ﴿وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ﴾ (الاعراف:۱۴۲) ''اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں''۔ اور پھر کوتاہی کی صورت میں واپس آ کر شکایت بھی کی تھی: ﴿بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ﴾ (الاعراف:۱۵۰) ''تم نے میرے بعد میری بُری نیابت کی''۔ یعنی تم نے خلافت کا حق صحیح طور سے ادا نہیں کیا۔ یہ بھی خلافت کا ایک تصور ہے' لیکن خلافت کے اصل تصور کو سمجھنے کے لیے انگریزی دورِ حکمرانی کے وائسرائے کی مثال کو سامنے رکھیے۔ اس دَور میں حاکمیت ملکہ برطانیہ یا شاہِ برطانیہ کی تھی اور دہلی میں ان کا وائسرائے ہوتا تھا جو ان کے احکامات کی تکمیل و تعمیل کرتا تھا' البتہ جن معاملات میں وہاں سے حکم نہ ملتا وہاں وہ حکمت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اپنی صوابدید سے فیصلہ کر سکتا تھا۔ یہ خلافت (vicegerency) کا صحیح تصور ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اُس وقت حاکم ملکہ برطانیہ یا شاہِ برطانیہ تھا جبکہ یہاں معاملہ شہنشاہِ ارض و سماء کا ہے اور انسان کی حیثیت خلیفہ (vicegerent) کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت عطا فرمائی' اس کا تذکرہ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ (البقرۃ:۳۰)

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔''

اسی طرح سورۃ الانعام کی آخری آیت اس موضوع پر قرآن حکیم کی نہایت اہم آیت ہے۔ اس میں یہ فلسفہ اپنی تکمیلی شان کے ساتھ بیان ہوا ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ ''وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا''۔ یہاں ''خَلَائِف'' جمع کا صیغہ آیا ہے۔ ﴿وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ ''تو تم میں سے بعض کو بعض پر فوقیت دی''۔ ﴿لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ﴾ ''تاکہ تمہیں جانچے' پرکھے اس میں جو کچھ اُس نے تمہیں عطا کیا ہے''۔ یہ جو تمہیں اختیار دیا گیا' autonomy دی گئی' اسی میں ابتلا ہے۔ اس زمین کو تمہارے چارج میں دے کر اور تمہیں اس کی خلافت عطا فرما کر تمہارا امتحان لیا جا رہا ہے۔ ﴿اِنَّ رَبَّكَ

سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۶۵﴾ ''بے شک تیرا رب جلد سزا دینے والا اور بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے''۔ اب تمہارے پاس دونوں راستے ہیں' ادھر جاؤ گے تو اللہ سزا دینے میں بھی دیر نہیں لگاتا اور وہ غفور ورحیم بھی ہے۔

تمدنی ارتقاء اور اجتماعیت کی مختلف صورتیں

خلافت کے حوالے سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ خلافت کس کی ہے' ایک فرد کی ہے' ایک بادشاہ کی ہے' ایک قبیلے کی ہے' ایک قوم کی ہے' عوام کی ہے' کس کی ہے؟ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ اصل میں اس مسئلے کا تعلق ہمارے دین سے نہیں بلکہ عمرانی اور تمدنی ارتقاء (social evolution) کے عمل سے ہے کہ انسان اس ارتقاء کی کس سطح پر ہے۔ عمرانی اور تمدنی ارتقاء کی تین سطحیں (stages) ہیں:

ایک زمانہ تھا جب انسان صرف قبائلی اجتماعیت سے واقف تھا۔ یہ قبائلی نظام پوری دنیا میں تھا اور اب بھی کہیں کہیں اس کے باقیات موجود ہیں۔ ہمارے ہاں بھی بعض علاقوں میں قبائلی نظام پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ قبائلی نظام میں ایک شیخ قبیلہ (قبیلے کا سردار) ہے۔ وہاں پر لوگوں میں سیاسی شعور (political consciousness) ابھی اتنا نہیں ہے کہ انہیں معلوم ہو کہ ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں' بلکہ سب شیخ قبیلہ ہی کا حکم مانتے ہیں۔ سیاسی و عمرانی ارتقاء کی اس سطح پر اگر شیخ قبیلہ خود اس تصور کو اختیار کر لے کہ میں حاکم مطلق نہیں ہوں' میرا اختیار محدود ہے' میں خود اللہ کا بندہ ہوں' اللہ ہی کے حکم پر چلوں گا اور اللہ ہی کے حکم کو نافذ کروں گا تو خلافت کا تقاضا' دین کا تقاضا' توحید کا تقاضا پورا ہو جائے گا☆۔

اس سے ذرا آگے چلیے تو عمرانی ارتقاء کے اگلے مرحلے میں بڑی بڑی حکومتیں اور مملکتیں (empires) قائم ہوئیں۔ اس دَور میں بھی اجتماعی شعور ملوکیت تک پہنچا تھا' اس سے آگے کا وہ اہل نہیں ہوا' اس لیے وہاں پر جمہوریت اور عوام کے حقوق کی بات قبل از وقت اور مالا یطاق کے درجے کی بات ہوتی۔ اس سطح پر بھی بادشاہ اگر خود کو اللہ کا بندہ تسلیم کر رہا ہے اور اللہ ہی کی مرضی کی تنفیذ کر رہا ہے تو خلافت کا حق ادا ہو گیا۔ مثلاً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ﷤ کی

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہی پوزیشن تھی' وہ کہیں کے بادشاہ نہ تھے بس ایک گھرانے کے سردار تھے' لیکن اللہ کے نبی تھے اور اللہ کا حکم نافذ کرنے والے تھے۔ گویا وہ اپنے خاندان میں اللہ کے خلیفہ تھے۔ (خطباتِ خلافت از ڈاکٹر اسرار احمد' ص ۷۹) (مرتب)

بادشاہت۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ؊ حقیقتاً خلیفہ تھے لیکن مجازاً انہیں بادشاہ اور ان کی خلافت کو بادشاہت کہا گیا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ﴾ (ص:٢٦)

''اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔''

داؤد علیہ السلام کی بادشاہت کا تعلق درحقیقت انسان کے تمدنی ارتقاء کی اس سطح سے ہے جس تک ابھی انسان پہنچا تھا' اس سے آگے اس کی رسائی نہیں تھی۔ لہٰذا تھی تو بادشاہت' لیکن وہ بادشاہت جب ایک بندۂ خدا کی ہے جو خود اللہ کا بندہ ہے' جو اپنے کُل اختیار کو اپنی مرضی سے اللہ کے قدموں میں ڈال چکا ہے' اور اسے معاشرے میں جو بھی حیثیت حاصل ہے اس کو وہ اللہ کی مرضی کی تنفیذ میں بروئے کار لا رہا ہے تو یہ درحقیقت خلافت تھی۔

عمرانی ارتقاء کی اس سطح پر اگر کوئی بادشاہ حکمرانِ مطلق ہونے کا دعویٰ کرے کہ میرا اختیار ہے' میرے پاس authority ہے' میں جو چاہوں فیصلہ کروں تو یہ کفر اور شرک ہے۔ اس کی مثال فرعون اور نمرود کی بادشاہت ہے۔ ایک طرف ان کی بادشاہت اور دوسری طرف داؤد اور سلیمان ؊ کی بادشاہت' سیاسی ڈھانچے کے اعتبار سے دونوں مشابہ ہیں' لیکن حضرات داؤد اور سلیمان ؊ کی بادشاہت تو حق ہے اور توحید و خلافت کے تقاضے پورے کر رہی ہے' لیکن دوسری طرف فرعون و نمرود کی بادشاہت کفر ہے' جنہوں نے اقتدارِ مطلق کا دعویٰ کیا تھا۔ فرعون کا دعویٰ تھا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ (النازعات) ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں'' اُس کا ربّ ہونے کا دعویٰ اس معنی میں تو نہیں تھا کہ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے' کیونکہ کوئی احمق ایسا نہیں تھا جو اس دعوے کو مان لیتا۔ وہاں ایسے بزرگ بھی موجود ہوں گے جن کے سامنے وہ خود پیدا ہوا تھا اور اس کا بچپن گزرا تھا۔ تو ظاہر بات ہے وہ خالق ہونے کا مدعی نہیں تھا بلکہ اس کا دعویٰ حاکم اور مالک ہونے کا تھا۔ قرآن حکیم میں اس کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ ''اے میری قوم! کیا ملک مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟''

﴿وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ﴾ (الزخرف:٥١) ''اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہیں؟'' یعنی یہ جو دریائے نیل اس ملک مصر کی معاشی لائف لائن ہے اور اس سے جو بھی آبپاشی کا نظام ہے' یہ میرے اختیار میں ہے' جس کو چاہوں پانی دوں اور جس کو چاہوں نہ دوں' جس کا چاہوں سوکھا چوڑا کر دوں اور جس کا چاہوں بند کر دوں۔ لہٰذا میں نہیں جانتا کہ کوئی بالاتر

اقتدار بھی ہے۔ یہ دعویٰ درحقیقت خدائی کا دعویٰ ہے اور یہ کفر اور شرک ہے۔ ☆

اس سے آگے اب تمدنی ارتقاء کا وہ دور آیا جس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی۔ اُس وقت بڑی بڑی حکومتوں کا دور اپنے پورے عروج کو پہنچ کر زوال سے دوچار ہو چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انسان میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا اور بادشاہت کے خلاف ایک ردّعمل پیدا ہوا کہ یہ بھی انسان ہیں' ان کے پاس بھی دو ہاتھ' دو پاؤں' دو آنکھیں ہیں جو ہمارے پاس بھی ہیں تو پھر یہ کیونکر خدائی حقوق (Divine Rights of the kings) کے مدعی بن کر بیٹھ گئے ہیں؟ جیسے ان کے حقوق ہیں ویسے ہمارے حقوق بھی ہونے چاہئیں۔ یہ شعور کی وہ منزل ہے کہ جس پر آ کر اب معاملہ جمہوریت تک آیا ہے۔ اس جمہوریت کے حوالے سے یہ جان لیجیے کہ اگر جمہوریت میں حاکمیت مطلقہ عوام کی تسلیم کی گئی ہے تو یہ کفر اور شرک ہے۔ جس طرح بادشاہت مطلقہ کفر اور شرک ہے اسی طرح عوام کی مطلق حاکمیت بھی کفر اور شرک ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت میں سولہ سو سال کا فصل ہے۔ اس میں انسان کی سوچ نے منزلیں طے کی ہیں' تمدن نے ارتقاء کا سفر طے کیا ہے' عوام میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا' اب شخص واحد کی حکومت نہیں چل سکتی۔ اقبال نے کس قدر پیاری بات کہی ہے کہ ابلیس کو بھی اپنی سٹریٹجی بدلنی پڑی اور اُس نے انسانی حاکمیت کے تصور کو اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی شکل دی تا کہ اس کی شیطنت برقرار رہے۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں علامہ اقبال ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں: ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خودشناس و خودنگر

یعنی عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں اب آدم خودشناس اور خودنگر ہو گیا ہے' اسے اپنے بارے میں احساس اور شعور ہے کہ ہمارے حقوق ہیں اور ان کی حفاظت کرنے کا اس میں داعیہ پیدا ہو گیا ہے' لہٰذا اب ہمیں یہ مشکل کام کرنا پڑا ہے۔ پہلے تو ہم ٹنوں کی مقدار میں گندگی ایک شخص کے سر پر رکھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے تھے' جیسے فرعون اور نمرود کے سر پر حاکمیت کا تاج رکھ کر ہمارا کام

☆ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شروع سے ہی حاکمیت اور خلافت کے درمیان معرکہ آرائی رہی ہے۔ گویا: ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی! (مرتب)

ختم ہو گیا' مگر اب انسانی شعور کے بعد وہ حاکمیت کا تاج جو حقیقتاً ٹنوں کی مقدار میں گندگی اور نجاست ہے' اس کو ہم نے تولہ تولہ ماشہ ماشہ عوام کے اندر تقسیم کر دیا ہے۔ اب وہ ایک شخص کی ملوکیت (monarchy) کے بجائے حاکمیت جمہور (democracy) کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس میں حاکمیتِ غیر اللہ جو اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی صورت میں موجود ہے' وہ کفر ہے' شرک ہے۔

اجتماعی خلافت کا تصوّر

اسلام میں حاکمیت کے بجائے خلافت کا تصور ہے اور جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا تب تک خلافت شخصی تھی۔ نبی اکرم ﷺ بھی خلیفہ تھے' لیکن جب آپؐ کا انتقال ہوا اور آپؐ کے ساتھ ہی وحی اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو خلافت میں ایک انقلاب برپا ہوا کہ شخصی خلافت ختم ہو کر اجتماعی خلافت وجود میں آ گئی۔ یعنی اسلام میں اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کے بجائے اجتماعی خلافت یا خلافت عامہ (popular vicegerency) کا اصول کارفرما ہے۔ اس خلافت کا ہمارے سامنے کامل ترین نمونہ جس سے بہتر کسی ریاست کا تصور ممکن نہیں' خلافت راشدہ کا تصور ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دور میں دین کامل ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کو ناقابلِ یقین حد تک اونچی چھلانگ لگوائی ہے ۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

خلافتِ راشدہ جو زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی' میرے نزدیک اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نوعِ انسانی کو جتنی بلند چھلانگ لگوا دی تھی' ابھی بحیثیت مجموعی انسانی شعور اس سطح تک نہیں آیا تھا' اور وہ ابھی اس بار کو اٹھانے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ چونکہ نبوت و رسالت کا مقصد ہی اِتمام حجت ہے اس لیے حضور ﷺ اس کا ایک نمونہ دکھا کر نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے حجت قائم کر گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت کے معاشرے اور ریاست کو بالفعل اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار پر قائم کر کے دکھایا' جس کا اعتراف دشمنوں نے بھی کیا۔ گزشتہ خطاب میں ایچ جی ویلز کا حوالہ آیا تھا کہ اُس نے تسلیم کیا کہ:

''اگرچہ انسانی حریت' اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے

ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ'' آج بہت سے لوگوں کو ناقابل عمل محسوس ہوتا ہے اور وہ اسے شاعری قرار دیتے ہیں' لیکن محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے بالفعل ایسا کر کے دکھایا۔ حضرات ابوبکر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی حکمران نہیں' بلکہ خادم تھے' ان کی زندگیوں کی پوری تصویر ہمارے پاس موجود ہے۔

''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' کے مصداق میں یہاں گاندھی کے مقالہ کا ذکر کرتا ہوں۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی مرتبہ ہندوستان میں صوبائی وزارتیں بنیں' اس وقت مسلم لیگ نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا' اس لیے کہیں بھی مسلم لیگ کی حکومت نہیں تھی اور پورے ہندوستان میں بیک وقت کانگریس کی حکومت تھی۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ اُس وقت گاندھی کا ایک مقالہ ''ہریجن'' میں شائع ہوا تھا' جس میں اُس نے اپنے وزراء کے لیے لکھا: ''میں آپ لوگوں کے سامنے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) کی مثال پیش کر رہا ہوں' ان کے پیچھے چلو''۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گاندھی نے ایسا کیوں کہا' اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا ہندوستان کی تاریخ اتنی بانجھ رہی ہے کہ یہاں کبھی بھی عظمت کا کوئی مظہر نہیں رہا؟ کیا بکرماجیت جیسا عادل بادشاہ ہندوستان میں نہیں تھا؟ کیا اشوک جیسا درویش بادشاہ ہندوستان میں نہیں رہا؟ پھر گاندھی نے ان کا نام کیوں نہیں لیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بادشاہ تھے اور بادشاہت کا دور ختم ہو چکا۔ لہٰذا یہ لوگ عہدِ حاضر کے لیے قابلِ تقلید نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَاِذَا ھَلَکَ قَیْصَرَ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ)) (۱)

''جب کسریٰ (شاہ ایران) ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا اور جب شاہ روم (قیصر) ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر دوبارہ نہیں ہوگا۔''

محمدٌ رسول اللہ ﷺ اس دور کے فاتح (افتتاح کرنے والے) ہیں جس دور میں

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب علاماۃ النبوۃ فی الاسلام۔ وصحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب لا تقوم الساعۃ حتی یمر الرجل بقبر الرجل ......

بادشاہت ختم ہو رہی تھی۔ اب بھی دنیا میں بادشاہت کہیں باقی رہ گئی ہے تو بدقسمتی سے صرف عالمِ اسلام کے اندر رہ گئی ہے۔ باقی مشرق و مغرب میں اگر کہیں بادشاہت موجود ہے تو صرف علامتی ہے' جو وہاں کے ''نیشنل میوزیم'' کی زینت ہے۔ مصر کے شاہ فاروق نے کہا تھا کہ عنقریب دنیا کے اندر صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے' ایک انگلستان کی بادشاہت اور چار تاش کے بادشاہ' ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہے گا۔

بہر حال انسان کی خلافت عامہ کا کامل ترین نمونہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے قائم کر کے دکھا دیا تاکہ نوعِ انسانی کے اجتماعی ضمیر پر ہمیشہ ہمیش کے لیے حجت قائم ہو جائے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد نوعِ انسانی میں جتنا بھی فکری' تمدنی' ذہنی اور معاشرتی ارتقاء ہوا ہے وہ سب درحقیقت حضور ﷺ ہی کا فیض ہے۔ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است☆

یعنی دنیا میں جہاں بھی کوئی خیر ہے' خوبی ہے' کوئی اعلیٰ قدر ہے' چاہے نظامِ عدالت کی ہو' نظام حکومت کی ہو' یا کسی اقتصادی نظام کی ہو' وہ درحقیقت یا تو محمد ﷺ سے مستعار لی گئی ہے یا ابھی انسان گھسٹ گھسٹ کر اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس منزل پر آج سے چودہ سو برس قبل محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کو پہنچا دیا تھا۔

خلافت راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی!

سیاسی نظام سے متعلق تیسری بات غور طلب ہے اور میری یہ بات شاید بہت سے حضرات کو چونکا دے کہ خلافت راشدہ دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ پہلی مرتبہ جب میں نے یہ بات کہی تھی تو برادرم مجیب الرحمٰن شامی نے ''قومی ڈائجسٹ'' میں میرا انٹرویو شائع کیا اور اس کی تشہیر کے لیے پوسٹر شائع کیا جس میں جلی حروف سے میرے یہ الفاظ نمایاں کیے گئے: ''اب خلافت راشدہ دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی!'' یہ بات ذرا تفصیل سے عرض کی جائے تو سمجھ میں آئے

☆ ''تم (آج) جہاں کہیں رنگ و بو کی وہ دنیا دیکھتے ہو جس کی خاک سے ''آرزو'' نشو و نما پاتی ہے' وہ یا تو نورِ مصطفیٰ سے روشن ہے یا اب تک تلاشِ مصطفیٰ ﷺ میں سرگرداں ہے۔'' (مرتب)

گی۔ میرا موقف یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا بعینہٖ وہی نقشہ دنیا میں اب قیامت تک نہیں آ سکتا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(ا) خلافت راشدہ' دورِ نبوت کا ضمیمہ: اگرچہ خلافت راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہد زریں کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دورِ خلافت راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظامِ حکومت میں تو جزو لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتے۔ مثلاً اوّلین اور اہم ترین یہ ہے کہ خلافت راشدہ درحقیقت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے' وہ دورِ نبوت کا ضمیمہ' تمہ اور تکملہ ہے۔ حضورﷺ کے بعد اب نہ تو نبوت کا کوئی امکان ہے اور نہ کسی نبوت کے تکملہ اور تتمہ کا۔

(ب) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی: محمد رسول اللہﷺ پر نبوت ختم ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں اشخاص کے مابین ایک درجہ بندی (gradation) ہوگئی' بایں معنی کہ حضورﷺ کی ۲۳ برس کی انقلابی جدّوجہد میں کون السّابقون الاوّلون ہیں' کون بدری ہیں' کون وہ ہیں جنہوں نے محمد رسول اللہﷺ کے ہاتھ پر بیعت علی الموت یعنی بیعت رضوان کی تھی اور کون وہ ہیں کہ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے: ﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ﴾ (الحدید:۱۰) ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا''۔ وقِس علیٰ ذٰلک۔ ظاہر ہے کہ اب انسانوں میں ایسی درجہ بندی نہیں ہوسکتی۔

دورِ نبویؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں بدری ہونا بڑے اعزاز کی بات تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت حاتم بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے ایک بڑی خطا ہوگئی تھی کہ حضورﷺ مکہ مکرمہ کی طرف پیش قدمی کا ابھی پروگرام بنا رہے تھے کہ ان صحابی نے راز فاش کر دیا اور مکہ والوں کو اطلاع پہنچا دی کہ محمدﷺ تم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ جرم اتنا بڑا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضورﷺ سے کہا: مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ حضورﷺ نے جواب دیا: اے عمر! تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ بدری ہیں اور اللہ نے اہل بدر کی ساری اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں۔

تو یہ وہ درجہ بندی ہے جو اس زمانے میں نہ توفی الوقت موجود ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے' اس لیے کہ یہ صرف نبوت کے ساتھ خاص ہے اور نبوت حضورﷺ پر ختم ہو گئی۔

(ج) سنّت خلفاء راشدین کا اتباع لازم: دورِ خلافت راشدہ میں جو فیصلے خلفائے راشدین نے کیے' ہمارے ہاں انہیں ایک ابدی حیثیت حاصل ہے اور وہ ہماری شریعت میں حجت ہیں۔ اُس دور میں جو اجماع ہوا وہ بھی ہمارے لیے حجت ہے۔ اجماع کے بارے میں نظری طور پر ہم کہیں گے کہ اجماع درحقیقت ممکن ہی اُس وقت تھا' اس کے بعد تو اجماع ہو ہی نہیں سکتا' اس لیے کہ اس کے بعد اُمت ایک وحدت نہیں رہی اور منقسم ہو گئی۔ اُس وقت اُمت نہ صرف فرقہ بندی سے پاک تھی بلکہ امت کے اندر کوئی سیاسی تقسیم بھی نہیں تھی' یعنی ہر اعتبار سے وحدتِ اُمت تھی۔ اس بنا پر فقہاء کرام نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کو اجماع کا درجہ دے کر ہمیشہ کے لیے واجب التزام قرار دیا ہے۔ رسول اللہﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))[1]

''پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو' اسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑے رکھو۔''

یہ معاملہ اب کسی اسلامی حکومت کا نہیں ہو سکتا۔ نظری طور پر ایک امکان ہے کہ جب وہ آخری دور آئے گا' اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوگا' اس وقت یقیناً پورے کرۂ ارضی پر ایک ہی اسلامی ریاست اور ایک ہی حکومت ہوگی۔ نظری طور پر اگر اس نوعیت کا اجتہاد اور اجماع ممکن ہے تو وہ اسی وقت ممکن ہے' ورنہ یہ اجماع اپنی کامل ترین صورت میں صرف دورِ خلافت راشدہ میں ہوا ہے۔

(د) قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء: دورِ خلافت راشدہ کے ان مثبت خصائص کے ساتھ ساتھ اس امرِ واقعی کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اُس وقت کا معاشرہ تمدنی ارتقاء کی اوّلین سطح پر تھا' یعنی خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھا' اور نظامِ مشاورت بھی لامحالہ اسی کی اساس پر استوار تھا کہ قبیلے کے سردار بیٹھ گئے اور فیصلہ ہو گیا۔ اُس دور میں اگر ہر ایک سے رائے لی جاتی تو یہ ایک بے مقصد کام ہوتا اور اسے پاگل پن سمجھا جاتا۔ اس لیے کہ اس وقت نوعِ انسانی کا سیاسی

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب العلم عن رسول اللہﷺ' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ سنن ابی داوٗد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔

شعور مجموعی طور پر اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' اور نہ صرف اُس وقت بلکہ بعد میں بھی طویل عرصے تک ''ریاست'' اور ''حکومت'' کے مابین کسی فرق و تفاوت کا فہم و شعور نوعِ انسانی کو حاصل نہ تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ تمدنی ارتقاء کا عمل بہت آگے جا چکا ہے۔

یہ دورِ خلافت راشدہ کے چار خصائص ہیں جن کا اعادہ اب نہیں ہو سکتا' لہٰذا میں اپنی رائے کے اندر تھوڑی سی لفظی ترمیم کر رہا ہوں کہ خلافت راشدہ تو قائم ہو سکتی ہے لیکن وہ خلافت راشدہ جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی اور درج بالا خصائص پر مبنی تھی' وہ اب دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی اور جو خصوصی حیثیت اس کو حاصل تھی وہ اب کسی حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

''تھیوڈیموکریسی'' اسلامی نظام سیاست کی جامع اصطلاح

اسلامی نظام سیاست کے حوالے سے چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں علم سیاست میں حکومتوں یا ریاستوں کے لیے کچھ عنوانات معین ہیں' مثلاً ملوکیت (monarchy)' الٰہی حکومت (theocracy)' جمہوریت (democracy)۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کی حاکمیت ہے تو اب سیاست کا ایک رشتہ مذہب کے ساتھ قائم ہو گیا۔ اسلام سے پہلے دنیا میں مذہب اور سیاست کے باہمی اشتراک کے لیے معروف عنوان ''پاپائیت'' یا ''الٰہی حکومت'' (theocracy) تھا۔ اس نظامِ سیاست میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قانون نافذ کرتا اور عملاً اپنی خدائی عوام پر مسلّط کر دیتا تھا۔ یہ تھیاکریسی آج کے دور کی گالی ہے۔ قائد اعظم نے بھی بار بار تھیاکریسی کی بجا طور پر شدید مذمت اور نفی کی۔ اس لیے کہ اسلام نہ منارکی ہے نہ تھیاکریسی ہے۔ اسلام ڈیموکریسی بھی نہیں' اس لیے کہ ڈیموکریسی اصلاً اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کی بنیاد پر قائم ہے اور اجتماعی حاکمیت بھی کفر و شرک ہے۔

اس حوالے سے میں واقعتاً مولانا مودودیؒ کی ذہانت و فطانت کو خراجِ تحسین پیش کر رہا ہوں کہ انہوں نے اسلام اور سیاست کے باہمی اشتراک کے لیے ''الٰہی جمہوری حکومت'' (Theo-democracy) کی بہترین اصطلاح وضع کی ہے۔ اس اصطلاح میں مذہب اور سیاست دونوں کے عناصر (elements) مل گئے ہیں۔ یعنی تھیاکریسی اور ڈیموکریسی دونوں کو جمع کر لیا جائے تو یہ Theo-democracy ہے' جس میں اجتماعی حاکمیت (popular sovereignty) کے بجائے خلافت عامہ (popular vicegerency) کا تصور ہے۔ یعنی خلافت بھی فرد کی نہیں رہی بلکہ عمومی ہو گئی ہے۔ Theo-democracy کی اصطلاح

میں جو ''تھیو'' اور ''ڈیمو'' کے دو عناصر ہیں' ان کی آپس میں نسبت کیا ہے؟ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے میں نے منارکی اور تھیاکریسی کی اصطلاحات استعمال کیں۔ تھیاکریسی میں ایک مذہبی طبقے کی اجارہ داری ہوتی ہے اور وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے ہیں۔ اسلام نے اس رویہ کو شرک قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ:۳۱) ''انہوں نے اپنے علماء' صوفیاء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے''۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ جو عیسائیت چھوڑ کر اسلام لے آئے تھے' انہوں نے ایک دفعہ بہت ہمت کی اور اس آیت کے بارے میں دبے دبے انداز میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کر لیا کہ میں عیسائی رہا ہوں' لیکن ہم نے تو کبھی اپنے علماء' صوفیاء یا راہبوں کو خدا نہیں سمجھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ راہب جس چیز کو حلال کہتے تم اسے حلال مان لیتے تھے اور جس چیز کو وہ حرام کہتے تھے تم اسے حرام مان لیتے تھے؟ یہ حلت و حرمت کا اختیار ہی خدائی اختیار ہے۔

عیسائیت تھیاکریسی کی راہ پر کیسے چل نکلی؟

حضرت مسیح علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ وہ شریعت موسوی ہی کے مجدد تھے یعنی ان کے کام کی نوعیت شریعت موسوی کی تجدید اور دین موسوی کی روح کو دوبارہ زندہ کرنا تھا' لیکن قانون کی حد تک وہی شریعت موسوی تھی۔ انجیل متی (Matthew) میں آپؑ کے یہ الفاظ آج بھی موجود ہیں:

Don't think I have come to destroy Law.

یعنی یہ مت سمجھو کہ میں شریعت اور قانون کو ختم کرنے آیا ہوں' بلکہ قانون اور شریعت یہی لاگو رہے گی' اس کا ایک حرف نہیں بدلے گا۔ اب یہ بات کہہ کر حضرت مسیح علیہ السلام چلے گئے' لیکن سینٹ پال نے بیک جنبشِ قلم اس شریعت کو ساقط کر دیا تو خلا پیدا ہو گیا۔ اب یہ خلا کیسے پُر ہوگا؟ کون بتائے گا حلال کیا ہے' حرام کیا ہے' جائز کیا ہے ناجائز کیا ہے؟ یہ سارا اختیار پوپ اور اس کے نائبین تک پہنچ گیا۔ اب ان کی مرضی اور ان کا اختیار ہے' جو چاہیں کریں۔ جیسے بادشاہ آرڈیننس نافذ کرتا ہے ایسے ہی پوپ کو آرڈیننس نافذ کرنے کا اختیار ہے۔ پوپ کو اختیار ہے' چاہے تو وہ یہودیوں کو حضرت مسیح علیہ السلام کا قاتل اور پھانسی چڑھانے والا شمار کرے اور چاہے تو انہیں ہر الزام سے بری کر دے۔ کُل کا کُل اختیار اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہی خدائی اختیار ہے اور اس کا دعویٰ شرک و کفر ہے۔

تھیوڈیموکریسی میں آزادی اور پابندی کا حسین امتزاج

Theo-democracy میں ''theo'' ''مذہبی عنصر اور ''demo'' سیاسی عنصر ہے۔ اب یہ دونوں عناصر کس تناسب سے آپس میں مربوط ہیں' یہ غور طلب مسئلہ ہے۔ قربان جایئے محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ آپؐ کا فرضِ منصبی تھا کہ لوگوں کو بات سمجھائیں۔ قرآن نے اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ﴾ (النحل:۴۴) ''ہم نے آپ پر یہ ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے''۔ یعنی آپ کے ذمے اس کی تبیین ہے' آپ اسے واضح کریں' اس کے مضمرات اور implications کو کھول کر بیان کریں۔

مذہب اور سیاست کا آپس میں تناسب کیا ہے' اس کے لیے حضور ﷺ نے اس قدر خوبصورت تشبیہ دی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی تشبیہ ممکن ہی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلٰی آخِیَّتِہٖ یَجُوْلُ ثُمَّ یَرْجِعُ اِلٰی آخِیَّتِہٖ))(۱)
''مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' گھوم پھر کر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے۔''

فرض کیجیے آپ کے پاس ایک کھلا میدان ہے' آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھوڑا اس میں چلے پھرے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ اسے باندھ کر بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ تو آپ اسے سوگز کی رسی کے ذریعے کھونٹے سے باندھ دیں۔ اس طرح سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ گیا' اس میں وہ گھوڑا آزاد ہے' جہاں چاہے جائے' شمال میں' جنوب میں' مشرق میں' مغرب میں' لیکن اس کی آزادی کی حد سوگز ہے اور وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہے پابندی اور اختیار کا حسین امتزاج یعنی آزادی بھی ہے اور پابندی بھی ☆۔

اس بات کو میں قرآن مجید کی دو آیات کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں'

---

(۱) مسند احمد' ح ۱۰۹۰۷' راوی: ابو سعید خدری ؓ۔

☆ گویا بقول اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے!

بظاہر ان آیات میں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ؕ﴾ (آیت ۱۵۴) ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی اختیار میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو زک پہنچی اور ستر صحابہ شہید ہو گئے۔ غزوۂ اُحد کے بارے میں جو پہلی مشاورت ہوئی تھی اس میں عبداللہ بن اُبی کا مشورہ یہ تھا کہ ہم کھلے میدان میں جنگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں' اس لیے ہمیں مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور حضور ﷺ کی ذاتی رائے بھی یہی تھی۔ لیکن حضور ﷺ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رجحانِ غالب کو مدنظر رکھا۔ خاص طور پر وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے یا بعد میں ایمان لائے تھے اور جن میں ذوقِ شہادت' جوشِ شہادت حد سے زیادہ موجود تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

ان صحابہؓ نے کہا کہ ہم بزدلی کیوں دکھائیں کہ اپنی گلیوں اور اپنے گھروں کے اندر محصور ہو کر مدافعت کریں۔ حضور ﷺ نے رجحانِ غالب کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کر لیا کہ مدینہ سے باہر جا کر جنگ ہو گی۔ اب جنگ کے دوران صحابہ میں سے بعض سے غلطی ہوئی' اطاعتِ نظم میں کوتاہی ہوئی تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا' ورنہ اللہ نے تو فتح دے دی تھی:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آل عمران:۱۵۲)

''اور اللہ نے تو تم سے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا جبکہ تم ان کو تہ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے' یہاں تک کہ تم ڈھیلے پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں محبوب ہے۔''

جب ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور جزوی طور پر مسلمانوں کو اس غزوہ میں نقصان ہوا تو اب چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہمارا بھی اختیار ہونا چاہیے' ہمارے ہاتھ میں بھی کوئی فیصلہ ہونا چاہیے۔ محمد (ﷺ) نے یہ کیا آمریت دکھائی ہے کہ جو چاہا فیصلہ کر دیا۔ یہ نظام اس طرح نہیں چلے گا' اس طرح تو روز روز حادثے ہوں گے' ستر ستر شہید ہوں گے' اس لیے ہمارا بھی اختیار ہونا چاہیے۔ اس کا جواب دیا گیا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے! امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ یعنی تمہارا کوئی اختیار نہیں!

اس حوالے سے دوسری آیت سورۃ الشوریٰ کی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾﴾ (الشوریٰ)

''اور جنہوں نے حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو' اور کام کرتے ہیں آپس کے مشورے سے' اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

یہاں ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠﴾ اتنا اہم اور اتنا مرکزی نکتہ ہے کہ اسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے درمیان لایا گیا ہے' حالانکہ قرآن مجید کے بے شمار مقامات میں یہ دو اصطلاحات اکٹھی آئی ہیں: ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ یہاں ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠﴾ کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ان دو کو پھاڑا گیا ہے' جیسے گٹھلی پھٹتی ہے اور درمیان سے دو پتیاں نکلتی ہیں' اور اس شان سے بات آئی ہے کہ ''ان کا معاملہ ان کے مابین باہمی مشورے سے ہوتا ہے۔''

اب بظاہر ان دو آیات میں تضاد ہے کہ سورۂ آل عمران کی آیت اختیار کی مطلقاً نفی کرتی ہے' جبکہ اس آیت میں اثبات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کو ہم آہنگ (reconcile) کیجیے کہ حقیقتاً' اصولاً' کلیتاً اختیار اللہ کا ہے' لیکن اللہ نے کچھ اختیار تمہارے حوالے بھی کر دیا ہے۔ جہاں اس کا صریح حکم آ گیا وہاں تو آپ کا اختیار بالکل ساقط ہو گیا' وہاں صد فی صد لوگ بھی اسے بدلنا چاہیں گے تو اللہ کے کسی حکم کو نہیں بدل سکتے' لیکن جہاں اُس کا حکم نہیں ہے وہاں تمہارا اختیار ہے' وہاں ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠﴾ کا حکم کارفرما ہے۔ مثلاً تمام حدود امر اللہ ہیں' جن میں کوئی ردّو بدل ممکن نہیں۔ حضورﷺ نے ایک بڑی پیاری حدیث میں اس کی بھی تشبیہ دی ہے:

((اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ)) (۱)

''آگاہ ہو جاؤ' ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے (جس میں کسی اور کو اپنے جانور چرانے کی اجازت نہیں ہے) جان لو اللہ کی بھی ایک محفوظ چراگاہ ہے اور وہ اس کے محارم ہیں۔''

یعنی وہ چیزیں جو اُس نے حرام کر دیں اس کے قریب بھی مت پھٹکنا۔ اگر کوئی چرواہا اپنی بکریاں کسی بادشاہ کی چراگاہ کے آخری حد تک قریب لے جائے گا تو امکان ہے کہ کوئی بکری چھلانگ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینه۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترك الشبهات۔

لگا کر اندر داخل ہو جائے گی اور وہ چرواہا گردن زدنی ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ کی جو چراگاہ ہے اس کے بھی قریب مت جاؤ' ذرا فاصلے پر رہو (keep at a safe distance)۔

اسی طرح ''امرُ اللّٰہ'' میں احکامِ شریعت اور اوامر و نواہی ہیں جن کے بارے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ اصل اہمیت ان ہی کو حاصل ہے' البتہ مباحات کے دائرے کے اندر اندر ''اَمْرُهُمْ'' ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نہیں دیا' جہاں شریعت کا کوئی حکم ثابت نہیں ہے' وہاں اللہ ہی کا دیا ہوا حکم ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ ہے' یعنی اس میں وہ اپنے باہمی مشورے سے معاملہ طے کریں گے۔ یہ ہے Theo-democracy۔ اللہ اور اس کے رسول کے احکام' اِس کا مذہبی عنصر ہے کہ اس کا انسانوں کی کثرت وقلت پر' تعداد پر' رائے دہی پر کوئی دار و مدار نہیں۔ باقی جہاں اللہ نے آزاد کیا ہے وہ سیاسی عنصر ہے کہ وہاں تم اپنے باہمی مشورے سے معاملات طے کرو۔ اسی کی نہایت خوبصورت تعبیر سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ اور رسول سے آگے مت بڑھو''۔ یہاں تک تمہارے لیے اختیار ہے' اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول سے تجاوز کرو گے تو قرآن کی رو سے ظالم بن جاؤ گے: ﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرۃ) ''اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا پس وہی تو ظالم ہیں''۔ یعنی پھر حقیقتاً اسلام ختم ہو گیا' صرف نام کا اسلام رہ گیا۔ یہ ہے معاملہ اسلام میں مذہب اور سیاست کے تناسب کا۔

تھیوڈیموکریسی کی عملی شکل

اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق پانچویں بحث یہ ہے کہ اس کی عملی شکل کیا ہوگی' اس اصول کو ہم عملی زندگی میں کیسے نافذ کریں گے؟ میرے نزدیک آج تک انسان نے اپنے تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں جتنے بھی اعلیٰ جمہوری معیارات (highest democratic norms) دریافت کیے ہیں ان تمام کو ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کے اندر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسان کو پورا اختیار ہے کہ کوئی بھی ہیئت بنائے' چاہے صدارتی نظام بنائے' چاہے پارلیمانی نظام بنائے' چاہے سنگل ہاؤس بنائے' دو ہاؤس بنائے یا تین ہاؤس بنائے' چاہے وحدانی نظام بنائے' اس کا دار و مدار حالات پر ہے۔ اگر ایسا ملک ہے جس میں ایک وحدانی حکومت چل سکتی ہے تو سب سے اچھی بات ہے' لیکن اگر ملک ایسا ہے جس میں وحدانی

نہیں وفاقی طرزِ حکومت چل سکتی ہے تو وفاقی طرز کی حکومت بنائی جائے۔ ان میں سے نہ تو کسی طرزِ حکومت کو حرام قرار دیا گیا ہے اور نہ کسی کا حکم دیا گیا ہے۔ الغرض جتنے بھی اعلیٰ جمہوری معیارات اور اقدار جہاں تک ہم اب پہنچے ہیں اور جہاں تک نوعِ انسانی تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں پہنچے گی' ان سب کا ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ کے دائرے میں بتمام وکمال نفاذ ہو سکتا اور ان کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے' اس لیے کہ اس کا تعلق سیاسی عنصر (demo) سے ہے۔ اب یہ آپ کی سوچ پر منحصر ہے کہ آپ پارلیمانی اور صدارتی نظام سے بھی بہتر کوئی نظام لے آئیں۔ اس میں شریعت کہیں کوئی پابندی نہیں لگاتی' کہیں آپ کے اوپر کوئی قدغن نہیں ہے۔

قرآن حکیم میں سیاسی نظام کے حوالے سے صرف دو ہی اصول دیے گئے ہیں: (i) حاکمیت باری تعالیٰ' اور (ii) ﴿اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾۔ ان دو کے تقاضے پورے کرنے آپ پر لازم ہیں۔ انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جائے گا' پسِ پشت نہیں ڈالا جائے گا۔ سورۃ الحجرات کی آیت میں پہلا اصول بیان کر دیا گیا کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ①﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

لیکن اس کی تفصیلی اور عملی شکل سورۃ النساء کی آیت ۵۹ میں بیان فرمائی گئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿٥٩﴾﴾ (النساء)

''اے اہل ایمان' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی مفید ہے۔''

اس آیت میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ﴾ ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی''۔ کیونکہ مطاعِ مطلق وہی ہے'

مطاعِ حقیقی وہی ہے' sovereign وہی ہے' حاکم حقیقی وہی ہے۔ ع ''سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے''۔ ساتھ ہی فرمایا:﴿وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو''۔ اس لیے کہ رسول کی اطاعت بھی درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے:﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء:۸۰) ''جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے رسول مطاع ہے:﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ (النساء:۶۴) ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے''۔ یعنی رسول کی اطاعت کی جائے اللہ کے نمائندے کی حیثیت سے۔ اب اللہ اور رسول دونوں کی اطاعتیں مستقل اور دائمی ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ''اَطِيْعُوا'' کا لفظ لایا گیا۔ آگے فرمایا:﴿وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)''۔

یہاں بہت عجیب اسلوب ہے کہ تین ہستیوں کی اطاعت کا حکم ہے: اللہ کی' رسول کی اور اولوالامر کی' لیکن پہلے دو کے لیے ''اَطِيْعُوا'' کا لفظ آیا ہے جبکہ تیسرے کے لیے نہیں ہے۔ یہاں دو اسلوب ہو سکتے تھے: (i) اَطِيْعُوا ایک مرتبہ آ جاتا اور اس کا اطلاق سب پر ہو جاتا: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' (ii) یا پھر تینوں کے ساتھ ''اَطِيْعُوا'' مذکور ہوتا: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِيْعُوا اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' لیکن قرآن نے ایک تیسرا اسلوب اختیار کیا کہ ''اَطِيْعُوْا'' دو کے ساتھ ہے' تیسرے کے ساتھ نہیں۔ اس اسلوب سے ان تین ہستیوں کی اطاعت کا مرتبہ (status) متعین ہو جاتا ہے۔ اللہ اور رسول کے ساتھ ''اَطِيْعُوا'' مذکور ہے' اس لیے ان کی اطاعت مستقل' غیر مشروط و غیر محدود ہے اور ہمیشہ ہوگی' یہ نہیں کہ کسی معاملے میں اطاعت ہو کسی میں نہیں' جبکہ اولوالامر کے ساتھ ''اَطِيْعُوا'' کا لفظ مذکور نہیں ہے' اس لیے اس کی اطاعت مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ پورے قرآن مجید میں اور میرے علم کی حد تک احادیث کے ذخیرہ میں بھی اولوالامر کے انتخاب کا کہیں کوئی طریقہ (process) معین نہیں کیا گیا۔ حضور ﷺ نے بھی کسی کو نامزد کرنے کی کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا' صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا گیا' پھر اس کا اعلان ہو گیا

اور مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمرؓ نے چھ افراد کا بورڈ بنا دیا۔ اس بورڈ کے باہمی فیصلے سے حضرت عثمانؓ کے والیٔ امر بننے کا معاملہ طے ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اولوالامر کے انتخاب کے معاملے میں ہمیں کوئی ایک معین راستہ نہیں ملتا۔ اس لیے اس کا انتخاب بھی ''اَمْرُهُمْ'' میں شامل ہے۔ اس معاملے میں باہمی مشورے سے جو بھی طے ہو جائے اس سے ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ﴾ کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ اگر بنیادی طور پر قبائلی نظام ہے تو اس کے مطابق یہ معاملہ طے کر لیں اور اگر جمہوری نظام ہے تو اس کے مطابق اولوالامر کا انتخاب کر لیں۔ اس معاملے کو ''لوہے کا جوتا'' نہیں پہنایا گیا بلکہ باہمی مشاورت پر آزاد چھوڑا گیا ہے۔ اگر اس معاملے میں کوئی معیّن صورت دے دی جاتی تو پھر تمدنی ارتقاء کے عمل سے جو نیا طریقہ وجود میں آتا' وہ اس میں سمویا نہ جا سکتا اور اسے اس کے اندر accommodate نہ کیا جا سکتا۔ لہٰذا قرآن میں اولوالامر کا ذکر تو کیا گیا ہے' لیکن اولوالامر کہاں سے آئے گا' اس کا انتخاب کیسے ہو گا' اس کا ذکر موجود نہیں۔ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا' ہر نبی اپنے دور کا اولوالامر ہوتا تھا' لیکن جب نبوت ختم ہو گئی' تو اب اولوالامر کہاں سے آئے گا۔ اس کو قرآن نے آزاد چھوڑا ہے۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اس کے لیے کیا نظام بناتے ہیں۔ آپ ہر بالغ کو ووٹ کا حق دیتے ہیں یا ووٹر کے لیے کچھ صفات معیّن کرتے ہیں۔

آپ کے بنائے ہوئے کسی بھی نظام سے اولوالامر منتخب ہو گیا' اس کے بعد بھی اس کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ ''پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلاف رائے ہو جائے''۔ یہ آپس کے اختلافات کی بات نہیں ہے' بلکہ آپ کا کسی معاملے میں اولوالامر سے کوئی اختلاف ہو جائے۔ مثلاً وہ کسی چیز کے بارے میں کہے کہ یہ اسلام کے مطابق ہے اور آپ کے نزدیک وہ اسلام کے خلاف ہو' تو ایسی صورت میں کہاں جائیں؟ فرمایا: ﴿فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ''تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف''۔ اس لیے کہ مستقل اطاعتیں وہی ہیں۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اگر تم حقیقتاً اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو''۔ ﴿ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾ ''یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتیجے کے اعتبار سے بہت مفید ہے۔''

اسلامی نظام سیاست میں عدلیہ کی اہمیت

پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کا جو ابتدائی عمل شروع ہوا تھا اس میں بڑی ردّ و قدح اور

بڑی محنت کے بعد قراردادِ مقاصد پاس ہوئی۔ جماعت اسلامی نے مطالبے کی زبردست تحریک چلائی اور بوریاں بھربھر کے ٹیلی گرام' خطوط اور محضرنامے بھیجے جو دستور ساز اسمبلی کے میزوں پر نظر آنے لگے۔ اِدھر اندر اللہ کے فضل وکرم سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مسلم لیگ کی تحریک کے مخلصین جو اسلام کے ساتھ ایک مخلصانہ ربط وتعلق رکھتے تھے' ان کی بھرپور جدّوجُہد کے نتیجے میں قراردادِ مقاصد پاس ہوگئی۔ اس کے بعد علماء بورڈ بنا دیا گیا۔ اب یہاں دو چیزیں ٹکرا رہی ہیں۔ ایک طرف آپ کی پارلیمنٹ ہے اور دوسری طرف علماء بورڈ۔ اب قانون سازی کا اختیار کس کو ہے؟ اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں۔ اول تو یہ کہ علماء کون ہوں گے؟ کس مدرسے کے فارغ التحصیل ہوں' کس درجے کی ان کے پاس سند ہو' کس فرقے سے ان کا تعلق ہو؟ پھر اس کے بعد یہ سوال آئے گا کہ آیا علماء بورڈ کا فیصلہ فائنل ہوگا یا نہیں؟ اگر فائنل ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے اوپر ایک اور پارلیمنٹ آ گئی ہے اور یہ یقیناً Theocracy کی ایک صورت بن گئی کہ حاکمیت علماء کے ایک طبقے کے پاس آ گئی' جس طرح ایران کا نظامِ حکومت ہے۔ یہ وہ عقدۂ لاینحل ہے کہ ہمارے ہاں کے سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والے اور دستوری مسائل پر سوچنے والے اس کا حل تلاش کرنے میں بے بس نظر آتے ہیں۔

اس کا حل سمجھ لیجیے! یہاں بھی تمدنی ارتقاء کے حوالے سے میں عرض کر رہا ہوں کہ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ ریاست کے تین اعضاء (organs) ہیں: (i) مقننہ (Legislature)' (ii) انتظامیہ (Executive) اور (iii) عدلیہ (Judiciary)۔ ریاست کی بنیاد ہوتی ہے دستور (Constitution) پر اور دستور کی حفاظت کرنے والی (custodian) عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتیں ہیں۔

میرے نزدیک ہمارے دستور کی صرف ایک دفعہ' جو پاکستان کے دستوری خاکے میں ہمیشہ ''رہنما اصول'' (directive principle) کی حیثیت سے موجود رہی ہے:

"No legislation will be done repugnant to the Quran and Sunnah"

''یہاں کوئی قانون سازی قرآن وسنت کے منافی نہیں کی جاسکتی''

اگر آپ اس ''رہنما اصول'' کو جوں کا توں نافذ العمل شق (operative clause) کا درجہ دے دیں تو میرے نزدیک اس دور میں اسلامی ریاست کا دستوری تقاضا صد فی صد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر پارلیمنٹ کے اندر کوئی قانون زیر غور ہے جس کے بارے میں آپ کو شک

ہے کہ وہ اس دفعہ سے ٹکرا رہا ہے اور اس میں کوئی شے قرآن وسنت کے خلاف ہے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ عدالت میں جائیں اور فیصلہ کرائیں۔ اگر آپ عالم دین ہیں تو خود بحث کریں اور اگر آپ خود عالم دین نہیں ہیں تو آپ کے پاس علماء موجود ہوں گے ان سے دلائل معلوم کریں اور عدالت میں جا کر دلائل دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اس کے ضمن میں نفیاً یا اثباتاً فیصلہ صادر کر سکیں' اور اگر کوئی قانون جزوی یا کُلی طور پر اس دفعہ کی زد میں آ رہا ہو تو اسے کالعدم قرار دے سکیں۔

ضیاء الحق مرحوم سے پہلے اس دفعہ کو صرف ''رہنما اصول'' (directive principle) کے طور پر رکھا گیا۔ ضیاء الحق نے اسے partially operative کر دیا' یعنی اسے عملی طور پر کارگر تو بنایا لیکن کچھ قدغنیں لگا کر' یعنی ایسے نیم دلانہ سے بھی کم تر انداز میں اور اتنی اگر مگر کے ساتھ کہ پورا معاملہ ایک لاحاصل مشق (Exercise in futility) ہی نہیں بلکہ باقاعدہ کھیل تماشے کی صورت اختیار کر گیا۔ میرے نزدیک یہ طرزِ عمل کفر سے بھی بدتر شے ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ (البقرة:٨٥)

''تو کیا تم (ہماری) کتاب کے کچھ حصے کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے؟ تو جان لو جو لوگ یہ روش اختیار کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی زندگی میں ذلّت ورسوائی میں مبتلا کیے جائیں اور قیامت کے دن شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں۔''

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ آپ شریعت کی بالادستی کو ایک حد تک' ایک دائرے میں قبول کرتے ہیں۔ یہی بات تھی جس پر میں نے ان کی مجلس شوریٰ سے استعفا دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے قرآن وسنت کی بالادستی کی عملی تنفیذ کے ضمن میں پیش رفت کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اصولاً تو درست تھا' لیکن ؎ ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے / ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے!'' کے مصداق آپ نے اس پورے معاملے کو فی الواقع ''تماشا'' بنا دیا۔ آپ نے الگ سے شرعی عدالتیں بنائیں جس سے دین و دنیا اور مذہب و ریاست کی ''دوئی'' اور

علیحدگی کے سیکولر تصور کو تقویت ملی۔ یہ معاملہ درحقیقت ہمارے پورے عدالتی نظام کے ساتھ ہونا چاہیے تھا' لیکن چلیے آپ نے فیڈرل شریعت کورٹ بنائی' پھر اس میں اپنی مرضی کے چنیدہ علماء رکھے۔ لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ اس عدالت کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ کمال یہ کہ عائلی قوانین کے لیے بھی ان کے ہاتھ باندھ دیے۔ مالی قوانین کے بارے میں تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وقت درکار ہے' کچھ مہلت چاہیے' کیونکہ پورے ڈھانچے کو آنِ واحد میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا' لیکن یہ کیا تماشا ہے کہ آپ نے عائلی قوانین کے بارے میں بھی ان کورٹس کو پابند کر دیا۔ میں نے مولانا تقی عثمانی صاحب سے اس بارے میں مسجد نبوی کے باہر باب جبریل پر بات کی کہ آپ کی غیرتِ دینی کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ ایسی عدالت میں بیٹھے ہوئے ہیں جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں' جو عائلی قوانین کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی۔ میں نے ضیاء الحق سے کہا تھا کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ جو میں کہہ رہا ہوں آپ وہ کریں' میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ نے جو کورٹ بنائی ہے اس کے ہاتھ کھول دیجیے۔ کم از کم عائلی قوانین پر تو انہیں فیصلہ دینے کا اختیار دیجیے۔ میرے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ ان عائلی قوانین کی بعض شقوں کو تمام مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء نے غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ ان علماء میں مولانا مودودی' مفتی محمد شفیع' مولانا ابوالحسنات' مولانا داؤد غزنوی اور مفتی جعفر حسین وغیرہم شامل تھے۔ میں نے کہا تھا کہ ان عائلی قوانین کا خالق غلام احمد پرویز بھی شریعت کورٹ میں جائے اور علماء کرام کے روبرو اپنے دلائل پیش کرے اور پھر عدالت اس پر اپنا فیصلہ سنائے۔

آج یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دستور کی محافظ و نگران (custodian) اعلیٰ عدالتیں ہیں۔ یہ ہے ہمارا تمدنی ارتقا جہاں تک آج انسان پہنچا ہے۔ اس میں لوگوں کی بڑی محنت لگی ہے اور بڑے تجربات کے بعد انسان یہاں تک پہنچا ہے۔ دنیا میں جس طرح سائنسی ارتقا ہوا ہے اسی طرح معاشرتی و تمدنی ارتقا ہوا ہے۔ اس معاملے میں ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم سائنسی ترقی کے تمام ثمرات سے تو متمتع ہو رہے ہیں لیکن معاشرتی و تمدنی ارتقا سے ہمیں کچھ الرجی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان میں جو چیزیں خلاف اسلام ہوں ان کو ہم رد کر دیں' لیکن جو چیزیں اسلام کے نظام میں سموئی جا سکتی ہوں ان کو اُٹھا کر پھینک دینا اسلام دشمنی ہے۔ چنانچہ آپ اعلیٰ عدالتوں کو اختیار دیجیے کہ پارلیمنٹ سے جو قانون پاس ہو اس کے بارے میں فیصلہ کر سکیں کہ

اس میں کہیں قرآن وسنت سے تجاوز تو نہیں ہوا!

اس ضمن میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے جج اس قابل نہیں ہیں۔ اس حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں ہم اصولی بات کر رہے ہیں' جبکہ اسلامی ریاست تو ایک انقلاب کے نتیجے میں قائم ہوگی۔ جب انقلاب آئے گا تو سارا معاشرہ تبدیل ہوگا' پھر یہ پوری صورت حال تبدیل ہو جائے گی۔ اصولاً تو یہ بحث اسلامی ریاست سے متعلق ہو رہی ہے جو ایک انقلاب کے نتیجے میں برپا ہوگی' لیکن اِس وقت بھی یہ ناممکن العمل نہیں ہے۔ اس لیے کہ آپ کے جج صاحبان بہت ذہین ہوتے ہیں اور وکلاء ان کی معاونت کرتے ہیں۔ ایک ذہین آدمی' جو پڑھا لکھا بھی ہے' اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہوتا کہ دو افراد کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کر سکے کہ کس شخص کی دلیل وزنی ہے اور آیا واقعتاً یہ چیز کتاب وسنت سے تجاوز کر رہی ہے یا نہیں؟ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ علماء بورڈ نہ تو قابل عمل ہے اور نہ ہی ممکن ہے' اور اگر ہو بھی جائے تو پھر وہ تھیا کریسی کی شکل بن جائے گی اور اس سے اسلام کی تھیوڈیموکریسی کا حق پورا نہیں ہوگا۔

اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ

علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں یہ بات کہی ہے کہ اس دور میں اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہوگا۔ اس بات پر علماء کو تو فطری طور پر بڑی ناراضی ہوتی ہے اور عام مسلمان بھی چونکتا ہے کہ پارلیمنٹ میں تو انگوٹھے لگانے والے بھی ہوتے ہیں' شرابی اور زانی بھی ہوتے ہیں' تو یہ اجتہاد کریں گے! میرے نزدیک اجتہاد کے بارے میں علامہ اقبال کی یہ رائے صدفی صد درست ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اجتہاد ارکانِ اسمبلی کریں گے' بلکہ اصل مراد یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی کہ کون سا اور کس کا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کرے گا۔ اجتہاد تو علماء ہی کریں گے' لیکن علماء کے اجتہاد میں اختلاف ہوتا ہے' جیسے امام مالک اور امام ابوحنیفہ میں اختلاف ہوا' امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں اختلاف ہوا' اسی طرح امام ابوحنیفہ' قاضی ابو یوسف اور امام محمد (رحمہم اللہ) میں اختلاف ہوا۔ اب کس کا اجتہاد نافذ ہوگا' یہ فیصلہ کون کرے گا؟ جب ملوکیت تھی تو اس کا فیصلہ بادشاہ کر سکتا تھا' کیونکہ اس کے پاس اختیار تھا۔ علماء کے پاس قوت اجتہاد تو تھی لیکن قوت نافذہ ان کے پاس نہیں تھی۔ یہی وہ کام تھا جو اُس وقت کے خلیفہ نے امام مالکؒ سے چاہا تھا کہ ہم آپ کی

''موطا'' کو یہاں کا قانون بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے اس پیشکش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اجتہاد صرف میرا ہی حق نہیں ہے' بلکہ یہ تمام اصحاب علم' اصحاب فکر اور دین پر غور کرنے والوں کا حق ہے۔ اگر میرے اجتہاد کو قانون کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو اجتہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا اور یہ مجھے گوارا نہیں۔ یہی بات تھی جس کو امام ابوحنیفہؒ نے رد کیا۔ انہیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں' مشقتیں برداشت کرنی پڑیں ہیں لیکن انہوں نے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ جو شخص قاضی القضاۃ بن گیا تو ریاست میں اس کا اجتہاد نافذ ہوگا' لیکن امام صاحب نے اس سے انکار کیا اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا۔ ان دونوں عظیم ترین ائمہ کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے بہت بڑا مینارۂ نور ہے کہ انہوں نے اجتہاد کے حق کو عام رکھا ہے۔ ایسا اگر ہوا ہے تو ہمارے دورِ زوال میں ہوا ہے۔ آج سے چند سو سال قبل اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے معتمد علیہ علماء کا ایک بورڈ بنایا' جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کیا اور بادشاہ نے اسے نافذ کر دیا۔

اجتہاد کے بارے میں فیصلے کا حق اب کسی فرد کو نہیں بلکہ پارلیمنٹ کو ہے۔ جیسے حاکمیت (sovereignty) نے ملوکیت سے جمہوریت تک کا سفر طے کیا ہے اور شخصی خلافت سے خلافت عامہ کی صورت اختیار کی ہے' اسی طرح اجتہاد کی تنفیذ کا حق بھی اب کسی فردِ واحد یا کسی ایک طبقہ کو نہیں ہے' بلکہ یہ حق پارلیمنٹ کو ہے کہ وہ کس کے اجتہاد کو نافذ کرے' لیکن اس میں خالص فنی اور عملی معاملے کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کیا جائے گا کہ اگر کہیں نص کی خلاف ورزی ہو تو آپ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایئے اور اگر خلاف ورزی نہیں ہے' قرآن وسنت سے تصادم نہیں ہے اور اس کو آپ نے دستور میں معیّن کر دیا ہے تو اب اس کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس لیے کہ اس کی گنجائش نصوص کے دائرے کے اندر ''اَمْرُھُمْ'' میں موجود ہے۔ اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں کہ اکثریت کی رائے کو مانا جائے' اور نہ ہی اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہے' کیونکہ علماء بورڈ کا معاملہ تھیا کریسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں یہ ہوگا کہ پارلیمنٹ میں غور و فکر ہوگا' سوچ بچار ہوگا اور اس کے بعد اکثریت رائے سے کوئی قانون نافذ ہوگا۔ اس process کے دوران بھی عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے کہ اگر کوئی دستور سازی کتاب وسنت کے منافی ہو رہی ہے تو ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اسی سٹیج پر اس کو روکا جا سکتا ہے۔ اگر بالفرض پارلیمنٹ سے کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا ہے' اگر کہیں کتاب وسنت سے تجاوز ہو گیا ہے' ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو جا کر عدالت کا

دروازہ کھٹکھٹایا جائے اوراس کے خلاف حکم امتناعی لا کر اس قانون کا نفاذ معطل کرادیا جائے اور اگر کوئی قانون نصوص کے دائرے کے اندر بنتا ہے تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ پھر آپ اکثریت کی رائے کو چلنے دیجیے۔ یہ ہے اصل مفہوم علامہ اقبال کے اس جملے کا کہ ''اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہوگا۔''

اسلامی نظامِ سیاست میں علماء کا کردار

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا' تو پھر علماء کیا کریں گے؟ اس پورے پراسس میں ان کا کیا کردار ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کی بات ہے۔ اُس وقت علماء بھی الیکشن میں حصہ لیں گے۔ علماء تو اس دور میں بھی حصہ لے رہے ہیں۔ مثلاً مفتی محمود صاحب بھٹو صاحب کو شکست دے کر پارلیمنٹ پہنچ گئے تھے۔ مولانا نورانی بھی رکن پارلیمنٹ منتخب ہو گئے تھے۔ تو یہ راستہ علماء کے لیے بند نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علماء کے کرنے کا جو اصل کام ہے' بدقسمتی سے اس کی طرف ہم نے توجہ نہیں کی ہے' اس کام سے ہمیں ذہول ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا اسلامی ریاست کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا۔ علماء اور خادمانِ دین کا اصل کام اسلامی نظامِ سیاست میں بلاواسطہ نہیں' بالواسطہ ہے کہ ان کے وعظ' ان کی نصیحت' ان کی تعلیم' ان کی تدریس اور ان کی تبلیغ کے ذریعے سے معاشرے کے اندر دو چیزوں کا لیول بڑھتا چلا جائے اور پھر یہ برقرار رہے۔ ان میں سے ایک جذبۂ ایمانی ہے' یہ جذبہ اجتماعی سطح (collective level) پر پہنچ جائے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اس جذبے سے سرشار ہوں کہ ہمیں مسلمان جینا ہے مسلمان مرنا ہے۔ یہ جذبہ اصل شے ہے اور اس جذبہ کا پیدا کرنا علماء اور خادمانِ دین کا کام ہے۔ یہ جذبہ کسی آرڈیننس کے اجراء یا cosmatic treatment سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر سیکولر معاشرہ ہے جس میں مادی اقدار عوام کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ میرا' آپ کا اور اچھے اچھے مذہبی لوگوں کا حال بھی یہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصل کرنے کا کام تو اس جذبۂ ایمانی کی بیداری ہے اور یہ کام علماء کریں گے' خادمانِ دین کریں گے۔ یہ کام اپنی بے نفسی کے ساتھ' اپنی بے غرضی کے ساتھ' اپنے آپ کو خاک میں ملا کر کرنے کا ہے۔

علماء کے کرنے کا دوسرا کام یہ ہے کہ معاشرے میں علم دین کے فہم کا بھی ایک لیول اجتماعی سطح (collective level) پر برقرار رہے تاکہ کوئی مداری دھوکہ نہ دے سکے اور

اسلام کے بجائے کسی اور شے پر اسلام کا لیبل نہ لگا سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کے اندر اجتماعی سطح پر ایک فہم ہو' انہیں معلوم تو ہو کہ اسلام کیا ہے' کیا چیز اسلام میں جائز ہے اور کیا چیز جائز نہیں ہے۔ علم دین کا یہ فہم اور جذبۂ ایمانی کی اونچے درجے تک اجتماعی سطح پر ترویج' یہ اصل دو کام ہیں جو علماء' خادمانِ دین اور خادمانِ قرآن کے کرنے کے ہیں۔ بلکہ ہر وہ شخص جس میں درج ذیل تین شرطیں پیدا ہو جائیں اس کے ذمے معاشرے میں فہم علم دین اور جذبۂ ایمانی کی ترویج کا کام ہے: (i) اسلام پسندی (ii) اسلام کی پابندی (iii) غلبۂ اسلام کی خواہش مندی۔ ان کے ذمے یہ کام ہے کہ دعوت و تلقین' تبلیغ' تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال کر کے لوگوں کے اندر ایک طرف جذبہ ایمانی کو برقرار رکھا جائے' اسے نیچے نہ گرنے دیا جائے' بلکہ اس کی سطح زیادہ سے زیادہ بڑھائی جائے اور دوسرے فہم دین اور علم دین کو لوگوں میں عام کیا جائے۔ انہیں صحیح طور پر معلوم ہو کہ دین کیا ہے اور کیا کیا چیزیں دین میں شامل ہیں۔

علماء کے کرنے کا تیسرا کام یہ ہے کہ اگر وہ کسی قانون کے بارے میں شک میں ہوں تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ہماری شریعت کورٹ کھلی دعوت دیتی رہی ہے علماءِ دین آئیں اور یہاں پر آ کر دلائل دیں' ہماری رہنمائی کریں۔ اگر وہ وہاں یہ کام نہیں کر سکتے تو بلاواسطہ انتخابات میں حصہ لیں اور دستور سازی میں اپنا کردار ادا کریں۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ علماء کا اصل کام بالواسطہ ہے کہ وہ معاشرے کے اندر جذبہ ایمانی اور فہم اسلام کی مقدار کو مسلسل بڑھائیں اور اس اجتماعی ارادے (collective will) یعنی ''مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا عزم مصمم'' کو برقرار رکھیں۔ جب تک یہ عزم اور ارادہ بحیثیت مجموعی قوم میں بیدار نہ ہو جائے اس وقت تک یہاں اسلام نہیں آئے گا۔ مداری کھیلتے رہیں گے اور اسلام کا نعرہ عوام سے ووٹ لینے کے لیے یا اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔

اسلامی ریاست میں شرطِ شہریت: اسلام

اب میں اپنے موضوع کی چھٹی بحث پر آ رہا ہوں۔ یہ ایک بڑا مشکل مسئلہ ہے اور لوگوں کے ذہن میں اس کے بارے میں بہت سی الجھنیں اور ابہام ہیں۔ اس مسئلہ کا تعلق اسلامی ریاست کی ''شرائط شہریت'' سے ہے' کیونکہ ''حقوقِ شہریت'' تو سب کو حاصل ہوں گے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آج تک جتنے بھی اعلیٰ ترین جمہوری معیارات دریافت ہوئے ہیں وہ سب ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کے دائرے کے اندر نافذ ہو سکتے ہیں۔ اس پر بحث کرنے کی

ضرورت نہیں ہے' اس لیے کہ آج تک انسان نے اس میدان میں جو بھی کچھ حاصل کیا وہ ؎

یا ز نور مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ است

کے مصداق یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ سے روشن ہے یا آج کا انسان اب تک تلاشِ مصطفیٰ ﷺ میں سرگرداں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تو انسان وہاں پہنچا ہی نہیں جہاں محمد ﷺ نے پہنچایا تھا۔ اسلامی نظامِ سیاست میں کوئی صدر' کوئی حکمران' کوئی خلیفہ قانون سے بالاتر نہیں ہے' جب عدالت اسے طلب کرے گی وہ عدالت میں پیش ہوگا۔ آج اعلیٰ ترین جمہوری اقدار میں بھی صدر اور حکمرانوں کے لیے استثناءات رکھے گئے ہیں۔ قانون کی بالادستی کا مطلب تو یہ ہے کہ صدرِ مملکت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ عدالت نے کسی کو پھانسی کی سزا دی ہو اور وہ اپنے اندازِ خسروانہ اور التفاتِ مرحمانہ کو بروئے کار لا کر اسے معاف فرما دے۔ یہ تو سراسر اسلام کے خلاف ہے' کیونکہ صدرِ مملکت کی حیثیت انتظامیہ (Executive) کی ہے اور اسلامی جمہوری ریاست میں سربراہِ ریاست کا کام انتظامی حوالے سے ہوتا ہے کہ وہ ملک و معاشرے میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ ہموار کرے۔ اس کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عدلیہ سے بھی بالاتر ہو جائے اور عدالت کی دی ہوئی سزا کو معاف کر سکے۔ یہ تو میں نے صرف ایک مثال دی ہے کہ اسلام نے نوعِ انسانی کو جہاں پہنچایا تھا وہاں تک تو معاملہ ابھی پہنچا نہیں' نہ امریکہ میں' نہ برطانیہ میں اور نہ زمین کے کسی اور کونے میں۔

اسلامی ریاست کی شہریت کے حوالے سے یہ بات نوٹ کر لیں کہ اساسِ شہریت اور شرائطِ شہریت کے اعتبار سے اسلامی ریاست کا مکمل شہری صرف مسلمان ہے' یعنی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کا اعلان و اقرار کرے وہ اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت ثانوی اور ''محفوظ اقلیت'' (proteted minority) کی ہے۔ وہ اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شہری نہیں ہیں۔ یہ بھی کڑوی گولی ہے جسے نگلنا آسان نہیں ہے۔

میرے گزشتہ خطاب کے بارے میں ایک صاحب نے کچھ احتجاج کیا تھا کہ آپ نے بھی عورت کی ثانوی حیثیت کی بات کر دی۔ اصل میں میں نے پاکستان ٹائمز کے ایک دریدہ دہن مراسلہ نگار کے الفاظ نقل کیے تھے جس نے کہا تھا کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن نے عورت کو ثانوی حیثیت دی ہے' لہٰذا اب ہمیں کچھ ایسے اصولِ اجتہاد وضع کرنے ہوں گے جو

قرآن کو بھی اوور رول کر سکیں —— اب کس کے اندر ہمت اور جرأت ہے کہ وہ ایسے اصول وضع کر سکے؟ ہم تو ایسی باتیں سن کر لرز جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ زندقہ ہے' ارتداد ہے' کفر ہے' شرک ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ:﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کڑوی گولی ہے' آسانی سے حلق میں نہیں اُترتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے سہج سہج' بڑے تدریجی انداز میں' اس سارے معاملے کو نافذ کیا۔ یہاں بھی معاملہ ویسا ہی ہے کہ اسلامی ریاست کا مکمل شہری صرف مسلمان ہے' اس لیے کہ اسلامی معاشرہ عقیدے اور نظریئے پر قائم ہے۔ وہ نظریہ اصولاً ایمان اور قانوناً اسلام ہے۔ غیر مسلم اس معاشرے میں مکمل شریک نہیں۔ ان کے حقوق کا احترام اور ان کی جان و مال کا تحفظ وہ سب کچھ اپنی جگہ پر ہے' ان کے ساتھ خیر ہوگی' بھلائی ہوگی اور خدمت خلق بھی۔ پھر چوٹی کی خدمت خلق یہ ہوگی کہ انہیں کفر و شرک کی گندگیوں سے نکال کر اسلام کی طرف لانے کی کوشش کی جائے۔ ان کی صرف دنیا کی بھوک نہ مٹائی جائے بلکہ انہیں قیامت میں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کی جائے' یہ سب سے بڑی خدمت خلق ہے۔

اسلامی ریاست نظریاتی ریاست ہے' اس لیے اس کی بنیاد علاقے (territory) پر نہیں ہے کہ جو بھی اس میں آ گیا' چاہے پارسی' عیسائی' ہندو ہو یا مسلمان' وہ اس ریاست کا ''برابر'' کا شہری ہے۔ اگر برابری کا حق تسلیم کیا جائے تو پھر یہ قومی ریاست (Nation State) بن جائے گی اور یہ ریاست کا وطنی تصور ہے جو دنیا کی سب سے بڑی تمدنی لعنت ہے۔ اسلام کی رو سے وہ کفر اور شرک ہے' لہٰذا اقبال نے اسے بہت بڑا بُت قرار دیا ہے ؎

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے!

چنانچہ اسلامی ریاست میں مکمل شہری صرف مسلمان ہے اور غیر مسلم کی حیثیت ثانوی ہے۔ البتہ یہاں غیر مسلموں کے حقوق' جان و مال' عزت و آبرو اور ان کے عقیدے کو پورا پورا تحفظ دیا جائے گا۔ عقیدہ وعبادت اور عائلی قوانین سمیت پورے پرسنل لاء کے ضمن میں غیر مسلموں کو مکمل آزادی ہوگی' لیکن اسلامی ریاست میں اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔ یہ کڑوی گولی ہے جسے بہرحال نگلنا ہوگا۔ اسلام پر آنے کے لیے اسلام کے مقصد (objective) کو سمجھنا ہوگا اور پھر یہ تمام چیزیں خود بخود ٹھیک ہوتی جائیں گی۔ یہ ایک مربوط حیاتیاتی اکائی (organic whole) اور ''منطقی کُل'' ہے جس کے اجزاء علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔

اسلامی ریاست ومعاشرے کے اصول: سورۃ الحجرات کی روشنی میں

سورۃ الحجرات انتہائی جامع سورت ہے' یہ مسلمانوں کے ملی اور سیاسی زندگی کے راہنما اصولوں پر مشتمل ہے۔ پہلا اصل الاصول دستوری اور قانونی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ......﴾ (آیت ۱)

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے آگے نہ بڑھو......''

دوسری آیت میں آنحضور ﷺ کے ادب' محبت اور تعظیم کا ذکر ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ......﴾ (آیت ۲)

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی (ﷺ) کی آواز سے بلند نہ کرو......''

ریاست میں افواہوں کی روک تھام کے لیے فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا......﴾ (آیت ۶)

''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تصدیق کر لیا کرو......''

اگر مسلمانوں میں کسی قسم کا اختلاف ہو جائے تو ''Nip the evil in the bud'' کے مصداق ان میں فوری صلح کرادو:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ﴾ (آیت ۹)

''اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرادو......''

پھر اس سورۃ میں چھ ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے جو دلوں کو پھاڑنے والے ہیں۔

(i) ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ......﴾ ''اے ایمان والو! تم میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے......'' (ii) ﴿وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ''۔ (iii) ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ (آیت ۱۱) ''اور ایک دوسرے کے برے نام نہ ڈالو''۔ (iv) ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''اے ایمان والو! سوئے ظن سے بچتے رہو' بے شک بعض گمان گناہ ہیں''۔ (v) ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور کسی کا راز نہ تلاش کرو''۔ (vi) ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ (آیت ۱۲) ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔''

اگلی آیت میں انسانی معاشرے کے اصول ''مساوات'' کا تذکرہ ہے' جس کی بنیاد

وحدتِ آدم ہے۔ گزشتہ خطاب میں اس آیت پر تفصیل سے گفتگو ہوئی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نر اور مادہ سے پیدا کیا' اور بنائیں تمہاری ذاتیں اور برادریاں آپس کی پہچان کے لیے۔ یقیناً تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

پوری سورت میں ایک ہی آیت ہے جو یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ سے شروع ہوئی ہے جبکہ پانچ دفعہ 'يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' آیا ہے۔ اسلامی معاشرہ نہ نسلی معاشرہ ہے' نہ لسانی' یہ حقیقتاً ایمان اور دستوراً و قانوناً اسلام کے اقرار کرنے والوں کا معاشرہ ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ایمان و اسلام کا فرق واضح کر دیا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیں تم ایمان نہیں لائے' لیکن تم یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اسلامی ریاست میں تمام مسلمان برابر ہیں

چونکہ ایمان ایک باطنی مخفی حقیقت ہے جس کا جانچنا ناممکن ہے اس لیے اسلامی ریاست کی شہریت کی قانونی اساس اسلام ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاست میں تمام مسلمان برابر ہیں اور کسی کے فاسق یا متقی ہونے سے اس کی شہریت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں ایک شائبہ ہے کہ ووٹ کا حق فاسق و فاجر کو نہیں ہونا چاہیے۔ اب کسی کے فاسق و فاجر ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ کیا مسجدوں میں رجسٹر کھول دیے جائیں' پنج وقتہ حاضری لگائی جائے اور جس کی کم سے کم پچاس فیصد حاضری ہو جائے اس کو ووٹ کا حق دے دیا جائے؟ اس طرح تو ایک ''تماشا'' بن جائے گا۔

میں اس حوالے سے عرض کر دوں: ''اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِمُسْلِمٍ'' کہ مسلمان مسلمان کا کفو (ہم سر) ہے۔ یعنی قانونی اور دستوری اعتبار سے فاسق' فاجر اور متقی برابر ہیں۔ حقیقت

کے اعتبار سے تو ایمان کے درجات زمین سے آسمان تک ہیں۔ کہاں ایمان ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا' کہاں ایمان آپ کا اور میرا! یہاں بات حقیقت کی نہیں بلکہ قانونی اور دستوری اعتبار سے ہو رہی ہے کہ سب مسلمان قانوناً برابر ہیں۔ میں تو یہ بھی عرض کروں گا کہ قانونی اعتبار سے منافق بھی مسلم شمار ہوگا۔ عبداللہ بن اُبی بھی قانوناً مسلم تھا' اس لیے وہ ریاست کا شہری بن گیا اور اس کی نماز جنازہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی۔ اس حوالے سے یہ ذہن نشین کر لیں کہ دستور اور قانون مؤمن اور منافق میں کوئی فرق نہیں کرتا' اس لیے کہ قانونی و دستوری بنیاد ایمان نہیں اسلام ہے' اور منافق بھی مسلم ہے' بایں طور کہ وہ اسلام کے قانونی تقاضے پورے کر رہا ہے' ارکانِ اسلام کا اقرار کر رہا ہے' ارکان پر عمل بھی کر رہا ہے۔ چلیے اگر وہ نماز نہیں پڑھتا تو اس کو سزا دیجیے' لیکن وہ کافر تو نہیں ہو جاتا' اس لیے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر تو نہیں' مسلم ہے۔

''اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِمُسْلِمٍ'' کے اصول کو سادہ سی مثال سے سمجھیے۔ فرض کیجیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن اُبی' اگر یہ دونوں کسی ایک باپ کے بیٹے ہوتے تو وراثت میں حصہ برابر ملتا یا کم وبیش ہوتا؟ اسی طرح ایک شخص پانچ وقت کا نمازی' تہجد گزار ہے اور ایک شخص کبھی کبھار نماز پڑھتا ہے' تہجد کا تو خیر سوال ہی نہیں' تو کیا یہ دونوں مسلمان ہونے میں برابر نہیں ہیں؟ ان جیسے معاملات میں واقعتاً امام ابوحنیفہؒ کی عظمت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ان کی بعض آراء کو متکلمانہ مباحث کا عنوان بنا دیا گیا ہے' اصل میں وہ متکلمانہ مباحث نہیں ہیں' بلکہ دستوری اور قانونی مباحث ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اصلاً فقیہہ ہیں اور فقہ صرف نماز روزے کے مسائل کا نام نہیں' اجتماعی مسائل' حکومت کے مسائل' ملت کے مسائل' ریاست کے مسائل' یہ سب اسی میں آئیں گے۔ آپؒ نے فرمایا: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ''ایمان زبانی اقرار کا نام ہے' یہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے''۔ ایک عام آدمی بھی اٹھ کر کہہ دے گا کہ یہ کیسی بچگانہ بات ہے' قرآن میں تو آیا ہے: ﴿فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا﴾ (التوبة: ١٢٤) ''تو ان کا ایمان بڑھ گیا''۔ ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ﴿٢٢﴾﴾ (الاحزاب) ''اس بات نے نہیں اضافہ کیا مگر ان کے ایمان میں اور تسلیم میں''۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہے کہ ایمان گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ آپ اہل یقین اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھیں تو آپ کو خود محسوس ہوگا کہ آپ کے اندر ایمان بڑھ رہا ہے' اور آپ کہیں غافلوں کی صحبت میں بیٹھیں تو بھی خود محسوس ہوگا کہ تھوڑی برابر ایمان تھا اس میں بھی کچھ کمی ہوگئی ہے۔ عام آدمی بھی سوچتا ہے کہ امام صاحب نے

اس یقینی بات کی کیسے نفی کر دی؟ امام صاحب کے کہنے کا اصل مطلب یہ ہے اِس ایمان کی بنیاد پر جو دستوری اور قانونی حیثیت اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے‘ وہ نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ جب تک آپ کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرتے رہیں گے تب تک اُس کے قانونی اور دستوری status میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ریاست اس کی تکفیر کر دے تو اس کا یہ status ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی شخص اسلامی عقائد یا ارکانِ اسلام میں سے کسی کی نفی کر دے تو وہ اسلام سے نکل کر کفر کی تاریکیوں میں چلا گیا‘ جیسے ختمِ نبوّت کے انکار کی بنیاد پر قادیانیوں کی تکفیر کر دی گئی اور وہ آپ کے دائرے سے نکل گئے۔

فزیالوجی کا ایک قانون ہے ”All or none law“ — بعض phenomena ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں percentage نہیں چلتی۔ دین کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں فی صد کا اطلاق نہیں ہوتا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً﴾(البقرۃ:۲۰۸) ”اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“۔ اور دوسری آیت میں پہلے ہی آپ کو سنا چکا ہوں: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ ”کیا تم کتاب کے بعض حصوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟“ یہ تو اتنا بڑا جرم ہے کہ دنیا میں ان کے لیے رسوائی ﴿خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ اور آخرت میں شدید ترین عذاب ﴿اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ ہے۔ یہاں بھی ”All or none law“ کا اطلاق ہوتا ہے کہ مانو تو پورا مانو‘ نہیں تو دفع ہو جاؤ‘ اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی غرض‘ احتیاج نہیں ہے کہ سارا نہ مانو تو چلو تینتیس فیصد مان لو۔ ہاں اگر خطا ہو گئی‘ کوئی گناہ ہو گیا‘ تقصیر ہو گئی‘ پاؤں پھسل گیا تو یہ اور بات ہے‘ لیکن آپ اسے تسلیم کر رہے ہوں۔ اور اگر آپ نے کسی گناہ پر ڈیرہ ہی جما لیا ہو تو یہ چیز کفر کے مترادف ہے۔ ایک شخص جب تک مسلمان ہے اس کے تمام حقوق قائم ہیں اور جب مسلمان نہیں رہا تو اس کے جملہ حقوق‘ بیک جنبش قلم ختم ہو گئے۔ درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے کہ یہ پچاس فیصد مسلمان ہے اس لیے اس کے پچاس فیصد حقوق ہوں گے۔ میرے نزدیک امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے اس موقف ”لا یزید ولا ینقص“ کا یہ مفہوم ہے۔

اس ساری بحث سے دو باتیں ثابت ہوئیں:

(i) اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام ہے۔

(ii) اس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں‘ فاسق اور متقی کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

اسلامی نظامِ سیاست میں ووٹر کی عمر

اسلام کے سیاسی نظام سے متعلق ساتویں بحث ووٹر کی عمر اور سیاست میں عورتوں کے عمل دخل کے بارے میں ہے۔ ووٹر کی عمر کے ضمن میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ چالیس سال ہونی چاہیے۔ مجھے اس حوالے سے قرآن مجید سے اشارہ ملا ہے۔ میں اسے نص صریح نہیں کہتا کہ وہ لازم ہو لیکن یہ ایک رائے ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآن کو follow کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے گا تو قرآن کا اشارہ بھی آپ کے لیے کافی ہوگا۔ میں نے جس اشارے کا ذکر کیا ہے وہ مجھے سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ سے ملا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ﴾ ''یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہو گئی......'' میرے نزدیک یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان کی ذہنی اور نفسیاتی بلوغت کی عمر چالیس برس ہے۔

ابھی حال ہی میں میری ملاقات ڈاکٹر ناصر صاحب سے ہوئی جو اینتھر وپولوجسٹ ہیں اور انٹرنیشنل سطح کی باڈیز میں وہ صدر بھی رہے ہیں' انہوں نے کہا کہ یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہے کہ انسانی زندگی کے تین علیحدہ علیحدہ سائیکلز ہوتے ہیں۔ اس وقت جو ہماری زندگی ساٹھ برس کی ہے' اس میں بیس بیس برس کے تین ادوار ہیں' اور انسان کی ذہنی' فکری اور نفسیاتی بلوغت کی عمر چالیس برس ہے۔

ڈاکٹر ناصر صاحب کوئی زیادہ مذہبی آدمی نہیں ہیں۔ وہ اپنے کچھ نظریات کے بارے میں مجھ سے گفتگو کرنے آئے تھے کہ ان میں کہیں قرآن مجید سے کوئی تضاد تو نہیں ہے۔ ایک عجیب بات انہوں نے اور بتائی کہ ہم نے انسان کی اصل زندگی کو سائنسی طور پر calculate کیا ہے۔ مرد کا ایک تولیدی خلیہ (sperm) جو جسم انسانی کا ایک یونٹ ہے حیات کے لیے سازگار ترین ماحول میں رکھا گیا اور پھر اس کی عمر کو calculate کیا گیا تو معلوم ہوا کہ انسان کی اصل عمر ۹۶۰ برس ہے۔ یہ تو ناسازگار ماحول کے باعث ہمارا زوال ہو رہا ہے' ہم گرتے جا رہے ہیں' ورنہ اگر حالات کو درست کیا جائے اور environments ٹھیک ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ انسان کی عمر ۹۶۰ برس تک ہو جائے۔ میں نے ان کو بتایا کہ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ برس کی عمر کا تذکرہ ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ﴾ (العنکبوت: ۱۴) ''ہم نے نوح کو اس کی

قوم کی طرف بھیجا' پس وہ ان میں پچاس کم ہزار سال رہے''۔ یہ حقائق سن کر وہ چونک گئے۔ اللہ کرے کہ ہم کوئی انقلاب لا سکیں! ابھی تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے' ابھی تو سیکولر جمہوریت چل رہی ہے' کیونکہ آپ خود سیکولر ہیں' لیکن اگر یہاں اسلامی انقلاب آ جائے اور اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو میری تجویز ہوگی کہ ووٹر کی عمر چالیس برس ہو۔

اسلامی نظامِ سیاست میں عورتوں کا کردار

اسلامی ریاست میں خواتین کا کیا عمل دخل ہے؟ یہ بھی ذرا کڑوی گولی ہے۔ میرے نزدیک خواتین رائے دہی میں شریک ہو سکتی ہیں لیکن امورِ مملکت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں کوئی نص صریح میرے پاس نہیں ہے' لہٰذا میں اس کو حرامِ مطلق نہیں کہتا' لیکن یہ چیز روحِ دین' نظامِ دین اور مزاجِ دین کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَانَ اُمَرَاؤُكُمْ شِرَارَكُمْ وَاَغْنِيَاؤُكُمْ بُخَلَاءَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))(۱)

''جب تمہارے حکمران بدترین لوگ ہوں اور تمہارے مالدار بخیل ہوں اور تمہارے امور تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں آ جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے زمین کی پیٹھ سے بہتر ہے۔''

یہاں بھی ''امور'' کا لفظ آیا ہے' جیسے ﴿هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ﴾ اور ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ میں ''الامر'' آیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی امر سے مراد اختیار اور انتظامی امور ہیں۔ یعنی اگر تمہارے انتظامی اُمور تمہاری عورتوں کے ہاتھ آ گئے تو تمہارا مر کر دفن ہو جانا بہتر ہے بنسبت اس کے کہ زندہ رہو اور زمین کی پیٹھ پر چلو۔ ☆

یہی طرزِ عمل' یہی معاملہ آپ کے گھر میں بھی ہونا چاہیے کہ فیصلہ کن امور عورتوں کے ہاتھ میں نہ آ جائیں۔ ـــ

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب الفتن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی النھی عن سب الریاح۔

☆ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بتایا گیا کہ اہل فارس نے بادشاہ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنا لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَاَةً)) (صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب کتاب النبی ﷺ الی کسری و قیصر) ''وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جو ایک عورت کو اپنا حاکم بنا لے۔'' (مرتب)

نے پردہ نہ تعلیم' نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد !

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ﴾ کے مصداق مرد کی حاکمیت گھر میں بھی ہونی چاہیے۔ڈوب مرنا چاہیے ان لوگوں کو جن کی بات اپنے گھر میں نہیں چلتی: ((فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا))۔

میرے نزدیک اسلامی ریاست میں عورتوں کو امورِ مملکت اور امورِ ریاست میں بالفعل کوئی حصہ دینا اس حدیث کی رو سے سرے سے جائز نہیں۔ یہ انتہائی منافقت ہے جس میں آج پوری قوم مبتلا ہے کہ عورتوں کو ووٹ کا بھی حق ہے' وہ الیکشن بھی لڑ سکتی ہیں' ان کو سب کچھ بنایا جا سکتا ہے' وہ اپوزیشن کی طرف سے بھی آ سکتی ہیں' وہ اسپیکر بھی بن سکتی ہیں☆۔ یہ سراسر حضورﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی ہے۔ یہ منافقت درحقیقت پچھلے گیارہ سال (ضیاء الحق مرحوم کا دورِ حکومت) میں بہت شدت کے ساتھ آگے بڑھی ہے۔ امورِ مملکت اور امورِ ریاست میں جتنا اس دور میں عورتوں کو آگے بڑھایا گیا' اس سے پہلے ایسا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ ہمارے اپنے کرتوت ہیں۔ ہم نے ''ہر میدان میں شانہ بشانہ'' کی جو رٹ لگا رکھی ہے اس کا نتیجہ اور کیا نکلے گا؟ بہرحال میری رائے یہ ہے کہ امورِ ریاست اور امورِ مملکت میں خواتین کو رائے دینے کی حد تک حق حاصل ہو سکتا ہے' لیکن اس سے آگے امورِ مملکت' تنفیذی امور' پالیسی بنانا' ان میں نہ غیر مسلموں کا حصہ ہو سکتا ہے اور نہ خواتین کا۔ پالیسی بنانے والے مسلمان مرد ہوں گے اور امورِ مملکت بھی مسلمان مردوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ کڑوی گولی بہرصورت نگلنی پڑے گی۔ بصورتِ دیگر ہم نہ اِدھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے —— اور مسلسل ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے!

کی تصویر بنے رہیں گے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: محمد زاہد' ادارتی معاون)

☆ پھر چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک خاتون دو مرتبہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیراعظم منتخب ہوئی۔ واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ خطاب اس دور سے پہلے کا ہے۔ (مرتب)

رزقِ حلال کی برکتیں اور رزقِ حرام کا وبال

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ہر جاندار کے زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔ اسی طرح انسان بھی زندہ رہنے کے لیے خوراک کا محتاج ہے۔ اس خوراک سے انسان کا جسم نشو ونما پاتا ہے۔ خوراک کا جسمانی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اچھی خوراک سے جسم کے اعضاء طاقت حاصل کرتے ہیں' جبکہ بری خوراک کئی طرح کی بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اچھی سے اچھی غذا کھائے۔ انسانی خوراک میں پھل اور سبزیاں' دودھ اور گھی' گوشت اور انڈے اچھی غذائیں ہیں۔ ان سے جسم مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ جس طرح خوراک انسانی جسم کو ظاہری طور پر متاثر کرتی ہے اسی طرح غذا کا انسان کی روحانی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ انسان کو حصولِ رزق کے لیے جائز طریقے بتا دیے گئے ہیں' چنانچہ جو شخص روزی حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع استعمال کرے گا اور رزق حلال کھائے گا اُس کے اخلاق و کردار مثبت طور پر اثر قبول کریں گے۔ یوں اس کے لیے نیکی کے کام کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس کا دل اللہ کی عبادت اور دوسرے نیک کاموں کی طرف مائل ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص روزی کمانے میں محتاط نہیں ہوتا اور اسے رزق حلال کے حصول کی فکر نہیں ہوتی' بلکہ اسے جس کام میں وافر روزی حاصل ہوتی نظر آتی ہے وہ اُسی کی طرف مائل ہو جاتا ہے' تو ایسے شخص کے اخلاق و کردار منفی اثر قبول کرتے ہیں۔

رزقِ حلال انسان کے کردار و عمل کو صحیح سمت کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہوتا ہے' اس لیے اسلام میں اس کے بارے میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''اے اہلِ ایمان! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے اور اللہ کا

شکرادا کرو اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو۔"

رزق کی فراہمی تو بہر حال اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اچھے برے اور نیک و بدسب کو روزی دیتا ہے۔ اب یہ انسان کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی قسمت کا رزق کس طرح حاصل کرتا ہے۔ اگر اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ حصولِ رزق کا کوئی ناجائز ذریعہ اختیار نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی قسمت کا رزق جائز اور حلال ذرائع سے دے گا' اور جس نے جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا' بلکہ جس جگہ سے اسے زیادہ روزی ملنے کی امید ہوئی اس نے وہی ذریعہ اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھی اس کا ازل سے طے شدہ مقسوم ہی ملے گا۔

انسان روزی کے حصول کے لیے جائز یا ناجائز جدّوجُہد تو کرسکتا ہے مگر روزی کا گھٹانا یا بڑھانا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں' کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ (الرعد:٢٦)

"اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق بڑھاتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے۔"

رزقِ حلال کی فضیلت واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(١)

"حلال روزی حاصل کرنے کی فکر و جدوجہد فرض کے بعد فریضہ ہے۔"

گویا جس طرح اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام نماز روزہ وغیرہ فرض ہیں اسی طرح روزی کمانے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنا بھی فرض ہے اور اللہ کے احکام کی بجا آوری کا نام عبادت ہے۔ اسی طرح صاف ستھری روزی کمانے والے کو جہاں دوسرے بہت سے فائدے ہوں گے وہاں ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس راہ میں کی جانے والی کوشش پر اسے عبادت کا ثواب ملے گا۔

روزی کمانے کا بڑا ذریعہ تجارت اور سوداگری ہے۔ جو شخص اپنی تجارت اور کاروبار میں سچائی اور دیانت داری اختیار کرتا ہے اور اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے اسے قیامت اور آخرت میں اچھے انجام کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ))(٢)

---

(١) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔

(٢) سنن الترمذی' کتاب البیوع عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی التجار......

''پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر (آخرت میں) نبیوں' صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔''

صاف ستھرے طریقے سے روزی کمانا آسان کام نہیں' کیونکہ نفسِ انسانی تو انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ کثرت کی خواہش اور طمع و لالچ انسان کو آسانی سے غلط راہ پر لے جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے :

﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳)

''بے شک نفس تو پورے زور کے ساتھ برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔''

اسی لیے جو شخص رضائے الٰہی کی خاطر یہ گھاٹی عبور کر لیتا ہے اسے جنت میں انبیاء' صلحاء اور شہداء کی رفاقت نصیب ہونے کی بشارت ہے۔

سب سے پاکیزہ اور بابرکت کمائی وہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((مَا اَکَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَیْرًا مِنْ اَنْ یَّاْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ ' وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانَ یَاْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدَیْهِ)) (۱)

''کبھی کسی نے کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمایا ہو۔ اور اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کماتے تھے۔''

ہاتھوں کی محنت سے کمانا کوئی گھٹیا کام نہیں بلکہ سنتِ داؤدیؑ ہونے کے ناتے فضیلت کی بات ہے۔ جو لوگ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں ان کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سی کمائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

((عَمَلُ الرَّجُلِ بِیَدِهٖ وَکُلُّ بَیْعٍ مَّبْرُوْرٍ))(۲)

''آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر تجارت جو پاک بازی کے ساتھ ہو (بہترین کمائی ہے)۔''

رزقِ حلال انسان کے وجود میں صالح خون پیدا کرتا ہے' جس سے اس کے دل میں

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب کسب الرجل وعمله بیده۔

(۲) مسند احمد' ح ۱۶۶۲۸۔ راوی : رافع بن خدیج ﷺ۔

نورانیت پیدا ہوتی ہے' جو اچھائیوں کی طرف مائل کرتی اور برائیوں سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس حرام اور ناجائز طریقوں سے کمایا ہوا مال نری ہلاکت ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بدترین۔ حدیث میں آتا ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا))(۱)

''بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے۔''

حرام کمائی میں سے اگر صدقہ وخیرات کیا جائے تو وہ بھی قبول نہیں' حتیٰ کہ جو شخص حرام مال چھوڑ کر مر جاتا ہے وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَکْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَیُقْبَلُ مِنْهُ فَیُبَارَکُ لَهُ فِیْهِ' وَلَا یَتْرُکُهُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا کَانَ زَادَهُ اِلَی النَّارِ' اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمْحُو السَّیِّئَ بِالسَّیِّئِ وَلٰکِنْ یَمْحُو السَّیِّئَ بِالْحَسَنِ' اِنَّ الْخَبِیْثَ لَا یَمْحُو الْخَبِیْثَ))(۲)

''ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ کسی ناجائز طریقے سے مال کمائے اور اس میں سے فی سبیل اللہ صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو' اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو۔ اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کے جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنْ عِنْدَ رَبِّهٖ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِیْمَ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِیْمَ اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَهٗ وَفِیْمَ اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِیْمَا عَلِمَ))(۳)

''قیامت کے دن اولادِ آدم کا کوئی فرد اپنے رب کے پاس سے اپنے قدم نہیں اٹھا سکے گا جب تک اس سے پانچ سوال نہ پوچھ لیے جائیں: (۱) زندگی کہاں فنا کی؟ (۲) جوانی کن مشغلوں میں بوسیدہ کی؟ (۳) مال کہاں (اور کن طریقوں) سے کمایا؟

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب لاطیب وتربیتھا۔

(۲) مسند احمد' ح ۳۴۹۰۔ راوی: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۳) سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

(۴) مال کہاں خرچ کیا؟ (۵) اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟''

ان پانچ سوالوں میں سے تیسرا اور چوتھا سوال مال کے بارے میں ہے کہ تو نے زندگی میں مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ گویا حرام مال دنیا میں تو انسان کھالے گا' پہن لے گا' بال بچوں کو کھلالے گا اور پیچھے بھی چھوڑ جائے گا' مگر آخرت میں اسے جواب دہی کرنا ہوگی اور آخرت وہ جگہ ہے جہاں کوئی سفارش اور رشوت نہیں چلے گی اور فیصلہ کرنے والا خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی۔

رزق حرام کی جتنی بھی برائی بیان کی جائے کم ہے' کیونکہ یہ کمائی انسان کو دوزخ میں لے جائے گی جس سے برا کوئی انجام نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ))(۱)

''وہ گوشت جنت میں نہ جاسکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو اور ہر گوشت (جسم) جو حرام مال سے پلا بڑھا ہے دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہے۔''

رشوت اور سود حرام کمائی ہے۔ جھوٹ بول کر' دھوکہ دے کر اور کم تول کر کی ہوئی کمائی حرام ہے۔ ملازم اگر شرائطِ ملازمت کے مطابق فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا مگر تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی حرام کمائی ہے۔ چوری کر کے ڈاکہ ڈال کر لوٹا ہوا مال مالِ حرام ہے۔ مالِ حرام تمام نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ حرام مال کھانے والے کا نماز' روزہ اور حج قبول نہیں۔ حرام مال سے نکالی ہوئی زکوٰۃ مسترد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلٰوةً مَا دَامَ عَلَيْهِ))(۲)

''جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگی۔''

ایک شخص بڑے ذوق وشوق کے ساتھ حج کو جاتا ہے' سفر کی صعوبت اٹھاتا ہے' وہاں دوڑ دھوپ کرتا اور مشقت اٹھاتا ہے' ہاتھ پھیلا کر اللہ سے دعائیں مانگتا ہے مگر اس کی دعا حرام مال کی وجہ سے مسترد کر دی جاتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

(۱) مسند احمد' ح ۱۳۹۱۹' والبیھقی فی شعب الایمان۔ راوی: جابر بن عبداللّٰہ۔
(۲) رواہ احمد فی المسند۔ والبیھقی فی شعب الایمان۔

اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے' وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہی اپنے سب مؤمن بندوں کو دیا ہے۔ (پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے کہ) اے پیغمبرو! تم پاک اور حلال غذا کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ (اہل ایمان کو مخاطب کر کے اس نے) فرمایا کہ اے اہل ایمان تم ہمارے رزق میں سے حلال اور طیب کھاؤ اور حرام سے بچو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسے حال میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گرد و غبار ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کے دعا کرتا ہے: اے میرے ربّ! اے میرے ربّ! اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے' اس کا پینا حرام ہے' اس کا لباس حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی نشو و نما ہوئی ہے۔ تو اس آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟''(۱)

حرام کمائی میں سود بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں سودی کاروبار کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو کچھ رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو' اگر تم ایمان والے ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس رات مجھے معراج ہوئی میرا گزر ایک ایسے گروہ پر ہوا جن کے پیٹ گھڑوں کی طرح ہیں اور ان میں سانپ بھرے ہوئے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ سود خور ہیں۔''(۲)

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حرام کمائی انجام کے اعتبار سے کس قدر خطرناک اور خوفناک

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب والطیب وتربیتھا۔

(۲) مسند احمد' سنن ابن ماجہ۔

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کمائی سے بھی منع کیا ہے جو مشتبہ ہو یعنی جس کا حلال وحرام واضح نہ ہو مبادا کہ وہ حرام ہو اور اس کا حصول عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں عام طور پر اس میں حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ ہم پاکستانی مسلمان بحیثیت مجموعی دنیا کی بدعنوان ترین قوم شمار ہوتے ہیں۔ رزقِ حلال کے حصول کی اہمیت نگاہوں سے دور ہو چکی ہے۔ دولت کی ہوس اور کثرت کی خواہش نے عاقبت کی گرفت کو ذہن سے نکال دیا ہے۔ یہ وہی دَور ہے جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

((يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ)) (۱)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروانہ ہوگی کہ وہ جو لے رہا ہے' حلال ہے یا حرام؟''

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر مسلمان اپنی روزی پر نظر رکھے اور جہاں کوئی مشتبہ چیز نظر آئے اسے بھی چھوڑ دے۔ پاکیزہ روزی حاصل کرے اور اسی سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ دنیا کی حیثیت و وجاہت اور status کی اہمیت ذہن سے نکال دے اور سمجھ لے کہ اس status کو بہتر سے بہتر کرنے کی جدوجہد میں اگر جہنم کی آگ میں جلنا پڑے تو کیا وہ ہمیں قبول ہے یا دنیا کی زندگی میں حلال پر اکتفا کر کے کمتر درجے کے status پر گزارا کرنا بہتر ہے جس سے عاقبت کی سزا سے بچا جا سکے؟ جب انسان اپنی اصلاح کر لے اور رزقِ حلال کے حصول پر کاربند ہو جائے تو پھر اپنے رشتہ داروں اور حلقہ احباب میں رزقِ حرام کی شناعت واضح کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہے اور موقع ملنے پر حقِ تبلیغ ادا کر کے سرخرو ہو۔ ورنہ رزقِ حرام کھانے اور کھانے والوں کو نہ روکنے کا انجام تو اوپر رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی روشنی میں واضح ہو چکا۔ ○○

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب من لم یبال من حیث کسب المال۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

وہ میرِ کارواں تھا جو چلا گیا

ڈاکٹر صہیب حسن (لندن)

یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے جب ابا جان (مولانا عبدالغفار حسن ؒ) کے حکم اور ڈاکٹر اسرار احمد کی خواہش پر میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کو داغِ مفارقت دے کر منٹگمری (حال ساہیوال) میں ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ قرآن ہوسٹل میں منتقل ہو گیا تھا۔ اِس ہوسٹل کے قیام کا مقصد تھا کہ کالج اور یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم طلبہ کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ علومِ اسلامیہ سے بھی واقفیت بہم پہنچائی جائے اور اس غرض کے لیے ڈاکٹر صاحب نے ابا جان کو بطور معلم و مربی وہاں آنے کے لیے آمادہ کر لیا تھا۔ میں بطور ہراول دستہ پہلے چلا آیا تھا۔

میں ابھی خود طلب علم کے مرحلہ سے گزر رہا تھا لیکن میری پیشانی پر فاضل عربی کا تمغہ مجھے معلم عربی کی حیثیت سے متعارف کرا چکا تھا۔ ہوسٹل میں میرا کام تھا کہ وہاں پر موجود طلبہ کو عربی پڑھاؤں اور اپنے فارغ اوقات میں بی اے (انگریزی) کی تیاری کروں۔ اس ہوسٹل کے مکین صرف پانچ طلبہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے برادر خورد ابصار احمد، ان کے ابن عم مظفر احمد، صلاح الدین، عبدالغنی اور ہمایوں۔ ہم نو واردان ہوسٹل کا برادرم وقار احمد سے بھی یارانہ رہا جو اپنی خاموش لیکن دل آویز شخصیت کی بنا پر ہر دلعزیز رہے۔ یہاں منتقل ہونے سے قبل چند دن ڈاکٹر صاحب کے مکان کی بیٹھک میں بھی مقیم رہا جہاں عارف اور عاکف کھیلتے کودتے اکثر آ نکلتے لیکن ڈاکٹر صاحب کا ایک اشارہ انہیں دوبارہ اندر کی راہ دکھا دیتا۔

باعتبار عمر ہوسٹل کے ساتھیوں سے میرا کوئی زیادہ تفاوت نہ تھا۔ میں اپنی عمر کے انیسویں سال میں تھا اور میرے یہ سارے رفیق میٹرک کرنے کے بعد کالج کی زندگی کا آغاز کر چکے تھے، لیکن عربیت اور مولویت کا جامہ اوڑھنے کی بنا پر میری بزرگی ہر حال میں قائم تھی، اُدھر ڈاکٹر صاحب کا جلال اور دبدبہ بھی ہم سب پر قائم تھا۔ یہ عقدہ تو بہت بعد میں کھلا کہ ان میں اور مجھ میں صرف دس سال کا فرق ہے، وہ خود بھی عربی پڑھنے کے خواہاں تھے لیکن ان کی سیال طبیعت کسی ایک درسی کتاب کی تنگنائیوں میں محدود ہونے سے بالا تھی۔ وہ آتے تو ایک فرشی نشست جم جاتی۔ پرانے طرز کی بڑی بڑی گول ''اسپولز'' پر مشتمل ٹیپ ریکارڈر آن ہو جاتا جس میں قاری عبدالباسط اپنی ساحرانہ قراءت کا جادو جگاتے نظر

آتے۔ڈاکٹر صاحب کبھی لیٹے' کبھی بیٹھے' سر دھنتے اور قاری عبدالباسط کی بلائیں لیتے۔ڈاکٹر صاحب سے میرا یہ اوّلین تعارف تھا جو پھر اگلے انچاس سال' میری لوحِ دماغ پر نت نئے نقوش بھرتا رہا۔ڈاکٹر صاحب کا پہلا درسِ قرآن بھی وہیں سنا اور وہاں کی ایک مسجد میں اُن کا ایک خطبہ جمعہ بھی۔

وہ جب رسول اللہ ﷺ سے منسوب اس جامع الکلم خطبہ کو اپنی گرجدار آواز کے زیر و بم کے ساتھ دہراتے تو دل دہل جاتے۔

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ
وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا كَذَبْتُكُمْ
وَاللّٰهِ لَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ
وَاِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ عَامَّةً
وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ
وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ
وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
وَلَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءًا
وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

ترجمہ: ''قوم کا پیش رو اپنے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔
اللہ کی قسم' اگر میں تمام لوگوں سے بھی جھوٹ بولوں تو تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔
اللہ کی قسم' اگر میں تمام لوگوں کو بھی دھوکہ دوں' تو تمہیں دھوکہ نہ دوں گا۔
میں خاص طور پر تمہاری طرف اللہ کا پیغامبر ہوں اور عمومی طور پر تمام لوگوں کے لیے۔
اللہ کی قسم جیسے تم (روزانہ) سوتے ہو ویسے ہی (ایک دن) مر جاؤ گے۔
اور جیسے (سونے کے بعد) اٹھتے ہو' ویسے ہی (قیامت کے دن) اٹھو گے۔
اور پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو' اُس کا حساب دو گے۔
اور پھر اگر اچھے کام کیے ہیں تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر برے کام کیے ہیں تو برا بدلہ ملے گا۔
اور یہ (بدلہ) ہمیشہ ہمیش کی جنت ہوگا یا ابدی جہنم۔''

(یہ خطبہ سیرت کی کتب اور جمہرۃ خطب العرب سے لیا گیا ہے)

ہر شخص اپنی زندگی میں دوسروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے' مجھے آج بھی یہ احساس ہے کہ میں نے اس نابغۂ عصر ہستی سے کیا کچھ استفادہ نہیں کیا۔ان کا زورِ خطابت' قرآن سے ان کا بے پایاں شغف' تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر' اسلامیانِ پاکستان کے مسائل کا وہ گہرا نبض شناس' مغربی افکار کا وہ بے رحم

ناقد' یہ سارے دریچے آہستہ آہستہ میرے سامنے وا ہوتے رہے اور میں اُن میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ غالباً تین ماہ کے بعد ابا جان بھی منٹگمری منتقل ہو گئے اور یوں مجھے بی اے کی تیاری کے لیے فراغت نصیب ہو گئی۔ البتہ وہاں کے مدرسہ رشیدیہ میں دو اسباق' نور الانوار (اصولِ فقہ میں) اور مسایرۃ مع مسامرۃ (علم الکلام میں) بھی جاری رکھے۔

۱۹۶۲ء میں بی اے (انگریزی) سے فارغ ہوتے ہی جامعہ اسلامیہ' مدینہ منورہ جانے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ میں منٹگمری سے رختِ سفر باندھ کر کراچی آ پہنچا جہاں پاسپورٹ اور ویزا کے حصول میں ایک دو ماہ کا قیام ناگزیر تھا۔ اب دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب منٹگمری چھوڑ چھاڑ کر کراچی منتقل ہو گئے ہیں جہاں وہ اپنے برادرِ بزرگ اظہار قریشی کی تعمیراتی کمپنی کے ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بالآخر میں عازمِ حجاز ہوا۔ سعودی سفیر نے پاکستان سے مدینہ یونیورسٹی کے پہلے دستے کو' جس میں مجھ سمیت اٹھارہ طلبہ شامل تھے' سفینہ حجاج سے جدہ روانہ کر دیا۔ یہ جہاز حاجیوں کو جدہ سے واپس لا چکا تھا اور اب مزید حاجیوں کو لانے کے لیے دوسرا پھیرا کر رہا تھا۔

مدینہ منوّرہ میں اگلے چار سال درس و مذاکرہ میں گزرے۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ سے فراغت اور اس کے اگلے سال مشرقی افریقہ کے ملک کینیا میں میری بحیثیت مبعوث آمد' مجھے پاکستان اور اہل پاکستان سے دور لے جاتی گئی' البتہ اپنی سالانہ چھٹی میں کبھی مدینہ منورہ (بغرض ملاقات والدین) اور کبھی پاکستان جانا لگا رہتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے تعلقات میں مزید استواری آتی گئی۔

میں نے نیروبی (کینیا) کے قیام کے دوران دو مختصر کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ایک مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ''اشتراکیت اور اسلام'' کا' اور دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا۔ یہ دونوں مقالات ندوۃ العلماء' لکھنؤ کے عربی جریدہ ''البعث الاسلامی'' میں بالاقساط شائع ہوئے۔ ان دنوں جمال عبدالناصر کی فکر اشتراکیت کو عربوں میں خوب پذیرائی حاصل تھی' اس لیے ''اشتراکیت اور اسلام'' کو عربی جامہ پہنانے کی سوجھی' اور ڈاکٹر صاحب کے کتابچہ کو عربی میں منتقل کرنے کی تحریک میں وہ جذبہ کام کر گیا جو ڈاکٹر صاحب کی تحریر و تقریر کی ساحرانہ تاثیر کا مرہونِ منت تھا۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ عرب قارئین میں اس عربی کتابچے نے ڈاکٹر اسرار احمد کو روشناس کرانے میں مدد دی۔

نیروبی کے نو سالہ قیام کے دوران ایک دفعہ مدینہ منورہ جانا ہوا تو دیکھا کہ ابا جان کے پاس ڈاکٹر صاحب تشریف فرما ہیں۔ غالباً یہ وہی سال ہے جب ڈاکٹر صاحب نے طبابت کو چھوڑ چھاڑ داعی الی اللہ کے فریضہ منصبی کو پوری طرح اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اپنی ملازمت کے حوالہ سے دار الافتاء' ریاض جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی دواؤں کا بیگ اٹھایا اور کہا کہ میں بھی

ساتھ چلتا ہوں۔ ٹیکسی کا یہ وہ طویل سفر تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کی صحبت حاصل رہی۔ اب کیا کیا کچھ باتیں ہوئیں' ذہن کے تار ہلا ہلا کر بھی یادداشت کی گرفت سے باہر نہیں آ رہیں۔ اتنا یاد ہے کہ انہی دنوں ''روزگارِ فقیر'' میرے مطالعہ میں رہی تھی' جس میں اقبال اور مسولینی کے مابین ایک مکالمہ درج تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے اقبال نے تمدنی اعتبار سے مسولینی کو ایک پتے کی بات کہی تھی کہ شہروں کی آبادی کو ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہونے دیا جائے' وگرنہ کئی خرابیاں جنم لیتی ہیں اور اس بات کو مسولینی نے خوب سراہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس بات کا تذکرہ کیا اور یوں بات چیت کا دھارا کئی موڑ لیتے لواتے ہمیں ریاض پہنچا گیا جو مدینہ منورہ سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں شیخ ابن باز سے ملاقات رہی' ہم دو یا تین دن بعد واپس چلے آئے۔

سعودی عرب میں زائر حضرات صرف ارضِ حجاز (یعنی مکہ' مدینہ' جدہ) تک آ جا سکتے ہیں۔ ریاض اسی صورت میں جا سکتے ہیں کہ اقامہ ہو یا وزٹ ویزہ رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے کہ نہ ان کے پاس وزٹ ویزہ تھا اور نہ اقامہ۔ جاتے ہوئے ہمیں کسی چیکنگ سے واسطہ نہ پڑا۔ واپسی کا سفر بھی بخیریت گزر گیا۔ مدینہ داخل ہونے سے پہلے ایک چیک پوسٹ پر اقامہ چیک ہوا تو آفیسر نے میرے رفیق سفر کے بارے میں پوچھا' میں نے کہا: ڈاکٹر ہیں اور پھر ٹیکسی کی ڈگی کھول کر ڈاکٹر صاحب کا میڈیکل بیگ آگے کر دیا۔ آفیسر نے دوسرا کوئی سوال نہیں کیا اور یوں ڈاکٹر صاحب بغیر کسی پریشانی کے نجد و حجاز کی طنابیں سمیٹ پائے۔ اور پھر میں دوبارہ عازم نیروبی ہوا اور ڈاکٹر صاحب عازمِ انگلستان جہاں اُس وقت ابصار' ایم فل اور پی ایچ ڈی کے بہانے فلسفے کی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔

پاکستان کے ایک اور سفر میں لاہور جانا ہوا' ڈاکٹر صاحب اس وقت کرشن نگر کو اپنی جولانی طبیعت کی آماجگاہ بنائے ہوئے تھے۔ ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی' بتایا کہ دیال سنگھ کالج میں ان کی تقریر ہے' عرصہ دراز کے بعد ڈاکٹر صاحب کی گھن گرج کو ایک دفعہ پھر سننے کا موقع ملا۔

میں ۱۹۷۶ء میں لندن وارد ہوا۔ اس سے تین سال قبل ۱۹۷۳ء میں لندن کا ایک نجی دورہ کر چکا تھا جس میں برادرم ابصار احمد سے تجدید ملاقات رہی۔ وہ ''ریڈنگ'' سے خاص طور پر لندن آئے۔ کہا کہ وارداتِ قلب بہت ہو چکیں' اب آؤ اور لندن کا قلب دیکھو۔ دن کی روشنی میں ہم میڈیم ٹساڈ کے مومی عجائب گھر اور شام کے دھندلکے میں پکاڈلی کی جگمگاتی روشنیوں کے نظارہ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فسانۂ زندگی میں لندن یاترا کا باب اضافہ کرتے گئے۔

اور پھر جب لندن میں مستقل قیام کے لیے آنا ہوا تو ڈاکٹر صاحب سے ہر ماہ ملاقات کی ایک صورت پیدا ہو گئی اور وہ یوں کہ ڈاکٹر صاحب نے پابندی سے جریدہ ''میثاق'' ارسال کرنا شروع کر دیا

اور پھر جب سے ''حکمت قرآن'' اور برادرم اقتدار احمد مرحوم کے ''ندائے خلافت'' کا آغاز ہوا' میری لائبریری ان تینوں پرچوں سے بھرتی گئی۔ یہ تینوں رسائل اب تک باقاعدگی سے میرے گھر کے دروازے پر ہر ماہ پابندی کے ساتھ دستک دیتے ہیں' میں انہیں مایوس نہیں کرتا' ایک ایک حرف پڑھتا ہوں' خاص طور پر ڈاکٹر صاحب کی تحریریں کہ جن میں تکرارِ مضامین کے باوجود خیالات کی آورد' الفاظ کی جھنجھناہٹ اور اشعار کی گدگداہٹ قاری کو منہ بسورنے نہیں دیتی۔

ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی قائم کی اور ہر داعی الی اللہ کی طرح انہوں نے ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کا نعرہ لگایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل مراسلہ میں مجھے تحریک سے وابستہ ہونے کی دعوت دی اور پھر اسی شدّومدّ کے ساتھ ان کے ایک انتہائی مخلص رفیق قاضی عبدالقادر صاحب نے بھی اس نامہ و پیام کو دوآتشہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر صاحب کی تحریک بیرون پاکستان (برطانیہ اور امریکہ وغیرہ) میں برگ و بار لانے کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ میں تذبذب کے عالم میں تھا' ابا جان سے بذریعہ مراسلت مشورہ کیا' ابا جان جماعت اسلامی کو خیر باد کہنے کے بعد سے تنظیم سازی اور جماعت بازی کے سخت مخالف ہو گئے تھے۔ میری برطانیہ کی جماعت اہل حدیث سے وابستگی کے وقت بھی ان کا یہی مشورہ تھا کہ جہاں بھی رہو' دین کا کام کرتے رہو' قال اللہ اور قال الرسول کی مجلسیں برپا کرتے رہو' لیکن کسی تنظیم کا حصہ بن کر باہمی چپقلش اور نزاعات میں اپنا وقت برباد کرنے سے بہتر ہے کہ مثبت طور پر دین کی دعوت پیش کرتے رہو۔ مجھے بیعت کے مسئلہ میں بھی شرحِ صدر نہ تھا اور اب بھی میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ بیعت خلافت کے علاوہ تمام دوسری بیعتیں میزانِ قرآن وسنت پر پوری نہیں اُترتیں (۱)۔ میں نے اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے اپنا معذرت نامہ ارسال کر دیا۔ گو میں رسمی طور پر تنظیم اسلامی میں شامل نہیں ہوا' لیکن میثاق اور ندائے خلافت کے صفحات پر تنظیم اسلامی کی کاوشوں کو ہمیشہ بنظر تحسین دیکھتا رہا۔ پاکستان کے دگرگوں حالات میں جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور جماعت اہل حدیث کی جدّوجُہد کو میں نے ہمیشہ سراہا اور ان خدام دین کے لیے بارہا دعا کی۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی وسعت ظرفی ہے کہ انہوں نے میرے اس معذرت نامے کے باوجود باہمی تعلقات میں کوئی آنچ نہ آنے دی۔ ان کی اکثر تحریریں جو کتابی شکل اختیار کر چکی ہیں' ملاقات کے موقع پر عنایت فرماتے' تدبر قرآن جلد دوم کا وہ نسخہ میرے پاس محفوظ ہے جو انہوں نے اپنے دستخط

---

(۱) یہ فاضل مکتوب نگار کی ذاتی رائے ہے۔ واضح رہے کہ علماء وفقہاءِ اُمت کی ایک معتدبہ تعداد دورِ صحابہ ہی سے بیعت جہاد کی قائل رہی ہے۔ اور محترم ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ان کی رائے کو قابل ترجیح سمجھتے ہوئے تنظیم اسلامی کے لیے بیعت کا نظام اختیار فرمایا۔ (ادارہ)

کے ساتھ عنایت فرمایا تھا۔ اس پر ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کی تاریخ مرقوم ہے۔

لندن میں ان کے پہلے جلسہ عام کی تقریب کا اہتمام میرے اپنے ادارے قرآن سوسائٹی کے زیر انتظام ہوا۔ قیام میرے ہاں تھا۔ میں شمالی لندن کے جس علاقہ (ڈ ڈگرین) میں مقیم تھا وہاں اُس وقت تک کسی مسجد کا قیام عمل میں نہیں آسکا تھا۔ ہمارے قریب ہی ایک صاحب نے اپنے دو منزلہ مکان کی نچلی منزل کا کمرہ پنج وقتہ نماز ادا کرنے کے لیے فراہم کیا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے نماز فجر کی امامت کے لیے کہا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے معمول کے مطابق پورے انہماک اور بلند آواز سے قراءت میں محو ہو گئے۔ پڑوس میں کسی انگریز کی رہائش گاہ تھی‘ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی‘ اب جو ڈاکٹر صاحب کی آواز کا آہنگ اس کی نیند میں خلل انداز ہوا تو اس نے اپنی جانب سے دیوار کو زور زور سے تھپتھپانا شروع کیا۔ ہم مقتدیوں کو تو اس آفت ناگہانی کا ادراک ہو گیا لیکن ڈاکٹر صاحب کو لندن کے اس دستورِ نو کا کیسے علم ہوتا۔ پہلی رکعت کے رکوع و سجود کا وقفہ جونہی ختم ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ قراءت کا آغاز کیا تو اس کا پارہ بھی سوا نیزے تک جا پہنچا‘ گھر سے نکلا اور ہمارے عارضی مصلی کے دروازے پر آکر جوتوں کو پھینکتا اور مغلظات بکتا رہا‘ پولیس کو بھی بلا لیا لیکن پولیس کے آنے تک طوفان تھم چکا تھا اور ہم نمازی آہستگی سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس لیے پولیس کسی جرم کی شہادت نہ پاسکی اور یوں یہ معاملہ اس کی خفیف سی تنبیہہ پر ختم ہو گیا۔ اب اس علاقہ میں ایک چھوڑ چار مسجدیں قائم ہو چکی ہیں جہاں مقامی کونسل کی ہدایات کے مطابق آدابِ جوار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب دوسری مرتبہ تشریف لائے تو ان کا حلقہ تعارف خاصا وسیع ہو چکا تھا۔ اس دفعہ ان کا قیام تنظیم سے متاثر ایک خاتون کی کوٹھی میں تھا جہاں ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ اور ایسے ہی ایک مرتبہ پھر جب وہ تشریف لائے تو مغربی لندن کے اس ہوسٹل میں عزیزم اسامہ کے ساتھ ملاقات ہوئی جسے یوسف اسلام نے خاص اس غرض کے لیے قائم کیا تھا کہ زائرین لندن کے لیے وہاں ہوسٹل کی سی سہولت میسر ہو لیکن اہل مغرب کی تمام قباحتوں سے پاک وصاف ہو۔

حزب التحریر کی دعوت پر وہ خلافت کے موضوع پر منعقد کی گئی ایک عالمی کانفرنس کے بھی مہمان رہے‘ لیکن اس مرتبہ مذکورہ جماعت کے حصار میں رہنے کے سبب ملاقات کی سبیل پیدا نہیں ہو سکی۔ یہاں مجھے اس بات کا شدید احساس رہا کہ ڈاکٹر اسرار احمد جیسے عالمی مدبر اور شیدائی قرآن کے لیے عربی زبان پر بھرپور دسترس رکھنا کتنا ضروری تھا۔ اگر ان کے علم میں حزب التحریر کے بانی تقی الدین النبہانی کی کتابیں اور مقالات ہوتے تو انہیں یقیناً اس بات کا ادراک ہوتا کہ خلافت کے باب میں ان کے اپنے نظریات اور حزب التحریر کے عقائد وافکار میں کتنا بعد ہے۔ کسی بھی جماعت کے بانی اور مؤسس کے افکار کا تفصیلی مطالعہ اس کے ساتھ اتفاق‘ اشتراک یا اختلاف وافتراق کی راہیں سجھاتا

ہے۔ احادیث احاد کی عقائد میں حجیت‘ بعض مسلمہ عقائد اور تحقیق خلافت کے بارے میں حزب التحریر کا طریق کار ڈاکٹر صاحب کے اپنے مسلک اور طریق کار سے اتنا مختلف ہے کہ مجھے ان کا اس کانفرنس سے خطاب کرنا اچنبھے کا باعث رہا۔ اسی طرح کا شکوہ مجھے اپنے ان عرب بھائیوں سے بھی ہے جو غلام احمد قادیانی کے اصل افکار سے لاعلمی کے باعث قادنیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

مجھے مسجد اقصیٰ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا جس کی روداد میرے سفر نامہ (بیت المقدس میں‘ تین دن) کی زینت بن چکی ہے اور پھر جب لاہور جانا ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے خصوصی دعوت سے نوازا کہ ان کے قائم کردہ قرآن آڈیٹوریم میں اس موضوع پر خطاب کروں۔ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے زیر صدارت کسی تقریب کا مہمانِ خصوصی بنا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ بنی اسرائیل کی تاریخ‘ یہود کی سرکشی اور مسلمانوں کی شکست و ہزیمت کی عکاسی ڈاکٹر صاحب اپنے مقالات اور دروس میں انتہائی بھرپور انداز سے کر چکے ہیں اور اس لیے مجھے اپنے ذاتی تجربے اور قلبی واردات کی روشنی میں ہی کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ میری تقریر مسجد اقصیٰ کی زیارت کے ان پہلوؤں سے متعلق رہی جو میرے ذاتی تجربے میں آئے۔ یہود کی چیرہ دستیوں کے چند ایسے پہلو بھی میں نے ذکر کیے جو عربی مصادر سے مستعار تھے اور ابھی اردو لٹریچر کی زینت نہ بنے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے صدارتی یا اختتامی کلمات میں جہاں میرے بارے میں کلماتِ تحسین ارشاد فرمائے‘ وہاں ان کے یہ الفاظ (کہ کچھ کہانیاں‘ کچھ حکایتیں) میرے جذبات پر اوس کی چادر چڑھا گئے۔ میرے خیال میں ہر مقرر کا اپنا اندازِ بیان ہوتا ہے‘ میرے سامعین یقیناً اس بات کو بخوبی جانتے ہوں گے کہ سوائے خطبۂ جمعہ اور دروسِ قرآن کے‘ میری تقاریر میں ظرافت اور حکایت بقدر ’’الْمُلَح فی الکلام کالمِلْح فی الطعام‘‘ ہوتی ہیں کہ جس کا مطلب ہے’’کلام میں ظرافت ایسے ہی ہے جیسے کھانے میں نمک‘‘۔ یہ مجھ ناچیز کا اپنا اندازِ بیان ہے‘ اس کا مقابلہ ڈاکٹر صاحب کے اندازِ بیان سے کہاں کہ جہاں طلاقتِ لسانی‘ موضوع کی روانی‘ اشعار کی فراوانی‘ قوسِ قزح کے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ بہرحال میں مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنی صدارت میں مجھے دعوتِ خطاب کا اعزاز بخشا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا بھرپور تجزیہ اور پھر اُس کا اُمّتِ مسلمہ کے دوادوار سے مقابلہ میرے نزدیک ان کی فکر رسا کے عظیم شہ پاروں میں سے ہے۔ میں نے اُن کی اس تحریر کو ہمیشہ سراہا ہے اور اس موضوع کو کچھ اضافوں کے ساتھ کئی محفلوں میں پیش بھی کیا ہے اور ’’قرآن مجید پر مسلمانوں کے حقوق‘‘ کی طرح اس مضمون کو تینوں زبانوں (اردو‘ عربی‘ انگریزی) میں پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ لندن میں چند سالوں سے پاکستانی و ہندوستانی ٹی وی چینلز کی بھرمار دکھائی دیتی ہے‘

لیکن ان کے طفیل ڈاکٹر صاحب سے بطور سامع ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ خاص طور پر کئی علمی و قانونی ہستیوں کے ساتھ ان کے مکالمات میری دلچسپی کا باعث رہے۔ اکثر میرے ذہن میں یہ بات کوندی کہ ڈاکٹر صاحب جیسی عبقری شخصیت کو پاکستان کی قیادت کا اعزاز حاصل ہونا چاہیے تھا' لیکن پھر اللہ تعالیٰ کی سنت استخلاف مجھے اپنے سوال کا جواب دے جاتی اور وہ یہ کہ سورۃ النور کی آیت ۵۵ جس میں ایمان والوں سے بشرطِ عمل صالح اور شرک سے کلی اجتناب کرنے پر زمین میں استخلاف اور تمکین کا وعدہ کیا گیا ہے' قرنِ اوّل کے ان مؤمنین پر تو پوری طرح صادق آئی جنہوں نے جزیرۂ عرب میں شرک کی جڑیں تک کاٹ پھینکی تھیں' لیکن بعد کے ادوار میں مسلم معاشروں کی دینی حالت میں بتدریج تنزل' بدعات وخرافات کی بھرمار اور شرکیہ مظاہر کے احیاء کے باعث ''کما تکونوا یُوَلّٰی علیکم'' یعنی ''جیسے تم ہو گے ویسے ہی والی تم پر مسلط ہوں گے'' کی کیفیت چھائی رہی۔ البتہ علماء مجددین کی کوششوں کی بنا پر نہ صرف معاشرے بھی اصلاح پذیر رہے بلکہ امراء کی بھی اصلاح ہوتی رہی۔ ائمہ اربعہ (ابوحنیفہ' مالک' شافعی' احمد ﷭) اور پھر عزالدین ابن السلام' ابن تیمیہ اور ہندوستان میں مجدد الف ثانی اور پھر شاہ ولی اللہ دہلوی' شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید ﷭' علماء حق کی وہ تاباں اور درخشاں مثالیں ہیں جو تاریخ اسلام کے لیے باعث افتخار رہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک بھی جزیرۂ عرب میں بدعت وشرک کی سر اٹھاتی جھاڑیوں کی صفائی سے شروع ہوئی اور پھر امیر ابن سعود کی مناصرت نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جو شیخ کے فکر پر استوار تھی اور جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ آلِ سعود کو ایک طویل عرصہ کے لیے استحکام حاصل رہا بلکہ سعودی عرب ایک ایسی واحد مسلم ریاست کے طور پر ابھرا جہاں شرک و بدعت کے جھنڈے ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گئے۔ بہرحال کسی بھی سلطنت کی بقا عوامل قوت (عدل' دیانت' امانت) کے عوامل ضعف (ناانصافی' خیانت اور فسق وفجور) پر غلبے سے مربوط ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ سرزمین توحید میں پہلی قسم کے عوامل کا غلبہ رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے کیا یہ بات کم ہے کہ انہوں نے ان مصلحین اُمت میں اپنی جگہ بنا لی جنہوں نے قرآن حکیم کو اپنی دعوت کا محور بنایا' سنت نبوی کی پاسداری اور بدعت سے بیزاری میں پیش پیش رہے۔ حکومتِ وقت کو ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ'' کے تحت اس کی خامیوں پر توجہ دلائی اور اس کے اچھے کاموں کی تحسین کی۔ منبر ومحراب کو دعوتِ اسلام کے لیے بھرپور استعمال کیا۔ اسلام کی سربلندی کے لیے ایک اجتماعی نظم کی بنیاد ڈالی۔ اپنی ذاتی زندگی میں زہد' سادگی اور قناعت کا قابل تقلید نمونہ پیش کیا۔ یہ سعادت حاصل کی کہ اپنی اولاد اور اپنے اقارب کو اپنے عظیم مشن میں دست و بازو بنا پایا۔

ڈاکٹر صاحب نے عام روش سے ہٹ کر کئی معرکۃ الآراء مسائل کو اپنی خداداد صلاحیت اور وکالت

سے نمایاں کیا۔ یہ وہ مسائل ہیں جن میں ہم عصر علماء اور مفکرین نے اُن سے کہیں اختلاف کیا‘ کہیں اتفاق کیا‘ لیکن وہ مخالفت کی پروا کیے بغیر اپنی رائے پر ڈٹے رہے۔ ان مسائل میں سرفہرست ہیں:

(۱) بیعت کی بنیاد پر تنظیم سازی: اشارتاً اس بات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے‘ بیعت ارشاد ہو یا بیعت خلافت (جسے بیعت کبریٰ بھی کہا گیا) اس موضوع کے موافق ومخالف دونوں پہلوؤں پر بہت کچھ احاطۂ تحریر میں آ چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اَخلاف اس موضوع پر مزید غور وخوض کر لیں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

(۲) مسئلہ احیاءِ خلافت۔ عصرِ حاضر میں حزب التحریر کو چھوڑ کر کسی اور شخصیت نے اس مسئلہ کو اس شد ومد کے ساتھ پیش نہیں کیا کہ جس کا اعزاز ڈاکٹر صاحب کو حاصل ہے۔ استخلاف فی الارض انعامِ خداوندی ہے‘ وعدۂ الٰہی ہے یا حکم ربی ہے‘ اس پر بحث ہو سکتی ہے‘ لیکن جس بات پر قطعاً اختلاف نہیں کیا جا سکتا وہ سیرتِ خلفائے راشدین سے متعلق ہے‘ ان کی سیرت کو اجاگر کرنا تاکہ خلافت حقّہ کے خدوخال نمایاں ہو کر سامنے آ جائیں اور مسلم حکمرانوں کے لیے نمونہ بن سکیں‘ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر وتحریر میں اس موضوع کو بہت عمدگی سے نکھارا ہے۔

(۳) مسئلہ مزارعت: مزارعت کی جو شکل رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھی اور آپؐ نے اس ضمن میں جو اصلاحات متعارف کرائیں وہ مزارعت کے لیے وجہِ جواز مہیا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ میں صاحبین کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ کی رائے کو اپنایا اور اسے سود سے مشابہ قرار دے کر ناجائز ٹھہرایا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب اصل مسئلہ سے ہٹ کر پاکستان میں رائج زمینداری اور مزارعت کی قباحتوں‘ غریب مزارعین کی مالکوں کے ہاتھوں ناانصافی کی چکی میں پسنے کی مظلومانہ کیفیت سے متاثر نظر آتے ہیں‘ لیکن کیا یہ ایسا ہی نہیں جیسے بینکنگ کا معاملہ ہو جو اپنے دامن میں بے شمار قباحتیں رکھتا ہے‘ جس میں سود سرفہرست ہے‘ لیکن اپنی ناگزیریت کی بنا پر فقہاءِ عصر نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسی کئی متعدد اصلاحات روشناس کرائیں کہ جن کی موجودگی میں بینکنگ کو قابل قبول بنا لیا گیا ہے۔ مزارعت میں بھی ایسا ہی تجربہ درکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تجدید عہد اور تجدید توبہ کی تحریک بار بار پیش کی۔ پاکستان کو عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نہ صرف پرچار کیا بلکہ عملی نمونے بھی پیش کیے۔ ان کی تحریک ’’رجوع الی القرآن‘‘ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن مسلمانانِ پاکستان نے ملکی سطح پر سیکولر طاقتوں کو ووٹ دے کر خود ہی عذابِ الٰہی کے کوڑوں کو ایسی دعوت دی ہے کہ سارا ملک مسائلستان بن چکا ہے۔ ایک آفت ٹلتی نہیں کہ دوسری آفت کا نزول ہو جاتا ہے‘ زمینی وآسمانی بلاؤں پر مستزاد باہمی قتل وغارت کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آتا۔ کاش کہ اسلامیانِ پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد

اور دوسرے مصلحین اُمت کی مخلصانہ التجاؤں اور درد بھری نداؤں پر کان دھرتے تو بدنصیبی اور شامت اعمال کے یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے!!

۲۰/اپریل ۲۰۰۷ء کو برادرم سہیل حسن کی معیت میں ڈاکٹر صاحب سے ان کے دفتر میں تفصیلی ملاقات رہی۔ اسے آپ ایک انٹرویو کہہ لیجیے جس میں ابا جان ﷫ سے متعلق ان کی یادداشتیں کریدنے کی کوشش کی گئی۔ اس انٹرویو کی تفصیل میں والد صاحب کے بارے میں ایک زیر طباعت کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔ افسوس کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ایک دو دفعہ پاکستان آنا ہوا لیکن سفر کا دورانیہ اتنا مختصر تھا کہ ملاقات کی سبیل پیدا نہ ہوسکی۔

۱۴/اپریل کی صبح SMS ملا کہ ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ پھر ایک پاکستانی چینل پر خبروں کی پٹی نے اس اندوہناک خبر کی تصدیق کر دی۔ میں نے برادرم ڈاکٹر ابصار کو فون کیا' انہوں نے بتایا کہ جنازہ تیار ہے اور ہم اس وقت قبرستان ہی کا رخ کر رہے ہیں' انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت سے کسی کو مفر نہیں' ڈاکٹر صاحب اللہ کے دین کی سرفرازی وسربلندی کی جدّوجہد کرتے اللہ سے جا ملے۔ اُمید ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں گے۔ دو دن بعد جمعہ تھا۔ میں مسلکاً اس بات کو جائز سمجھتا ہوں کہ ایسے مقتدر اشخاص کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جاسکتی ہے کہ جنہوں نے دین اسلام کی خاطر قابل قدر جدّوجُہد کی ہو' چنانچہ مسجد توحید لندن میں نماز جمعہ کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی جس میں جمعہ کی جماعت کے تقریباً ایک ہزار نمازی شریک تھے اور یوں میں اپنے محترم بزرگ کا ایک آخری حق ادا کرسکا جو بُعدِ مکانی کے باوجود ادا کیا جا سکتا ہے۔

اللّٰھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه۔ اللّٰھم ادخله جَنّتك الفردوس مع الانبیاء والصِّدِّیْقین والشهداء والصالحین

وصلی اللّٰه تعالیٰ علی نبینا محمد وعلی آله وصحبه اجمعین○○

(تحریر بمقام مکہ مکرمہ: اواخر شعبان ۱۴۳۱ھ)

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ۔ایک ہمہ جہت شخصیت

ضمیر اختر خان

اللہ تعالیٰ نے بشمول انسان کے تمام مخلوقات کے لیے موت کے حوالے سے اپنا ضابطہ قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمٰن)۔۔۔۔اور

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران:۱۸۵' العنکبوت:۵۷)

جو یہاں آیا ہے اسے بالآخر جانا ہے۔ ہمارے محترم اور نہایت ہی شفیق بزرگ' عالم' فقیہہ' متکلم وخطیب جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ اسی الٰہی ضابطے کے تحت اپنی آخری منزل کی طرف چل دیے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ:۱۵۶)

ڈاکٹر غازیؒ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل انسان تھے۔وہ بیک وقت ایک عالم دین' فقیہہ' متکلم وخطیب' قانون دان' ماہر تعلیم' دانشور' مصلح اور اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔اگرچہ انہوں نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر بہت اچھی سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ان سے میرا پہلا تعارف جولائی ۱۹۹۰ء میں ایک سیمینار کے دوران ہوا جس میں انہوں نے ''فرقہ بندی اور معاشرے پر اس کے اثرات'' کے موضوع پر نہایت مدلّل اور پُرجوش خطاب فرمایا تھا۔میں نے تقریر کے اختتام پر منتظمین سے درخواست کی کہ اس خطاب کا کیسٹ مجھے مہیا کیا جائے۔انہوں نے کمال مہربانی سے وہ کیسٹ مجھے عطا کیا' جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔میں نے متعدد بار اسے سنا اور اس کا عنوان اپنے طور پر بدل کر ''مسلمانوں میں فرقہ بندی کا افسانہ'' رکھ لیا اور بہت سے لوگوں کو استفادے کے لیے دیتا رہا۔ بعدازاں اسی موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی کتاب بھی مجھے مل گئی جو اپنی جگہ جامع ہے' مگر جو انداز' دلائل اور جوش وجذبہ ڈاکٹر غازیؒ کے اس خطبے میں ہے' اس کی تاثیر بہت زیادہ ہے اور ابھی تک برقرار ہے۔

دسمبر ۲۰۰۳ء میں ہم نے ایک سیمینار منعقد کیا اور اس میں ایک بار پھر ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کو مدعو کیا۔اس بار ان کا موضوع Religious Motivation and Geostrategic compulsions of Pakistan تھا۔عنوان انگریزی میں ہونے کے باوجود اور خود انگریزی پر عبور رکھنے کے باوجود انہوں نے خطاب اردو میں کیا اور ایسا پُرجوش خطاب کیا جس کی تازگی اور تحرک

(vibration) ابھی تک برقرار ہے۔ پرویزی حکومت میں وزیر مذہبی امور ہونے کے باوجود انہوں نے جس بے باکی سے عالم اسلام کے اتحاد اور پاکستان کے مسلم دنیا کے حوالے سے کردار پر جذباتی انداز میں بات کی اس نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کے تصور کی دھجیاں اڑا دیں اور نہ صرف پرویزی فکر کے تار د پود بکھیر دیئے بلکہ مجھ سمیت بہت سوں کو رُلا دیا۔ ان کے خطاب کا انداز بھی ہمیشہ منفرد ہوتا تھا۔ میں نے کبھی انہیں طویل تمہیدیں باندھتے نہیں سنا۔ حمد و ثنا کے فوراً بعد ہی موضوع پر جوشیلے انداز سے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کا ایک اور خطاب بعنوان ''اسلام میں تفریح کا تصور'' تقریباً تین گھنٹوں پر مشتمل میرے پاس ہے۔ اس میں جیسے ہی تعارفی کلمات کے بعد انہیں مدعو کیا گیا انہوں نے فوراً موضوع پر بولنا شروع کر دیا اور مسلسل بولتے رہے اور ایک ہی رفتار د آواز سے بولتے گئے۔ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسا ذومعنیٰ جملہ بولتے کہ ہمہ تن گوش سامعین عین سنجیدگی کے عالم میں بے اختیار ہنس پڑتے۔ ڈاکٹر غازیؒ کی ایک اور انفرادیت یہ تھی کہ وہ علماء کے درمیان جدید دانشور لگتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے مابین علماء کے ترجمان وحمایتی محسوس ہوتے تھے۔ وہ ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں کو مطمئن کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر انہیں اظہارِ خیال کی دعوت دی جائے لگتا تھا جیسے اسی کے متخصّص (specialist) ہیں۔ تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی ایک تقریر اس موضوع پر میرے پاس موجود ہے۔ اس میں انہوں نے بڑے خوب صورت انداز میں اہل ایمان کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنی تابناک تاریخ سے روشنی حاصل کر کے اپنے حال کو سنواریں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ ان کی مسلسل کوشش تھی کہ مسلمانوں کو زوال کے اسباب سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان کا سد باب کیا جا سکے۔ اندلس (Spain) کی تاریخ کا خاص طور پر حوالہ دیتے تھے جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک شاندار طریقے سے حکومت کی اور عظیم الشان تہذیب وتمدّن کی بنیادیں رکھیں۔ پھر وہاں سے ان کا صفایا کر دیا گیا۔ غازیؒ صاحب کے نزدیک حکمرانوں کو سب سے زیادہ تاریخ سے واقف ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ قوموں کا حافظہ ہوتی ہے' فرد اگر اپنا حافظہ بھول جائے تو اس کا مقام پاگل خانہ ہوتا ہے' اگر قوم اپنا حافظہ کھو بیٹھے تو اس کا کیا مقام ہونا چاہیے۔ قیادت پر فائز لوگوں کو تاریخ کا گہرا شعور ہونا چاہیے تاکہ قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر سکیں۔ (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۵)۔

ڈاکٹر صاحب قلم کے بھی شہسوار تھے اور متعدد تحقیقی کتب کے مؤلف ومصنّف تھے۔ آپ نے سو سے زیادہ علمی وتحقیقی مقالے مختلف کانفرنسوں میں پیش فرمائے جن میں سے اکثر ملکی وبین الاقوامی جرائد میں طبع ہو چکے ہیں۔ وقیع علمی وتحقیقی کتب کے علاوہ ان کی بعض کتب تو ان کے خطابات سے ہی

مرتب کی گئی ہیں۔ان میں سرفہرست محاضراتِ قرآنی' محاضراتِ حدیث اور محاضراتِ فقہ ہیں۔یہ خطابات مستورات کے اجتماعات میں مختصر نوٹس کی مدد سے دیے گئے تھے' مگر ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غازی صاحب کو علم سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر فقہ اسلامی کے ماہر تھے لیکن ان کی بعض دوسری تحریریں ان کے فکر کی بلندیوں اور وسعتوں کی گواہی دیتی ہیں۔میرے سامنے اس وقت ان کی ایک ایسی ہی تالیف ہے جس سے ان کے فکر کی ہمہ گیری کا پتا چلتا ہے۔اس کا عنوان ہے ''محکماتِ عالم قرآنی' علامہ اقبال کی نظر میں' قرآنی دنیا کی امتیازی خصوصیات اور اس کی بنیادیں (جاوید نامہ کی روشنی میں)''۔یہ کتاب ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور نے اپنی صاحبزادیوں کو املا کروائی تھی اور یہ معلوم ہے کہ املا کرانے اور الگ سے بیٹھ کر غور وخوض کر کے کسی موضوع پر لکھنے میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ان کی یہ مختصر مگر جامع تالیف ان کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ سے کماحقہ آگاہی کی بھی آئینہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر غازیؒ صاحب کو بے پناہ ذہانت وفطانت سے نوازا تھا۔میں نے جب بھی ان سے کوئی استفسار کیا یا کسی موضوع پر گفتگو کی' وہ فوراً اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔یہ کوئی تین چار سال پہلے کی بات ہے وہ اسلامی یونیورسٹی' فیصل مسجد میں اپنے دفتر میں تشریف فرما تھے۔میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔اثنائے گفتگو میں مغرب کا عالم اسلام کے ساتھ رویہ زیر بحث آیا تو فوراً مجھے اپنا ایک مضمون دراز سے نکال کر دیا جو ''تعمیر افکار'' کی اشاعت بابت ماہ اکتوبر ۲۰۰۷ء میں بھی چھپ چکا ہے۔مضمون کا عنوان ہے ''اسلام اور مغرب۔موجودہ صورت حال' امکانات' تجاویز''۔یہ بھی آپ کی فی البدیہ تقریر تھی جس کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے آپ کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا تھا۔یہ مضمون مغربی دنیا کے حوالے سے آپ کی فکر کا نچوڑ ہے۔اس کے ذریعے آپ نے بڑے جامع انداز سے مسلمانوں کے ساتھ مغرب کے رویے کا تجزیہ کیا ہے اور مسلمانوں کو مغربی طاقتوں کے عزائم سے خبردار کیا ہے۔وہ مغرب اور اسلام کی موجودہ کشمکش کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''امتِ مسلمہ کے عالم گیر کردار میں یہ بات بنیادی طور پر شامل ہے کہ ان کا ایک طویل عرصے تک یہودیوں اور عیسائیوں سے واسطہ رہے گا' مقابلے کی نوعیت پیش آتی رہے گی' تصادم ہوتا رہے گا' اور اس تصادم کے لیے مسلمانوں کو یہ دو سورتیں (سورۃ البقرۃ' سورۃ آل عمران) تیار کر رہی ہیں''۔(تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰)

موجودہ مغرب جس کا سرغنہ امریکہ ہے اور کبھی اس کا کرتا دھرتا برطانیہ تھا' ہر ایک کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔اس کے ڈانڈے بھی یہود ونصاریٰ کے آغازِ اسلام کے طرزِ عمل سے ملتے ہیں۔ڈاکٹر غازیؒ کے الفاظ میں:

''جس کو ہم مغرب کہتے ہیں اس سے مسلمانوں کا مقابلہ رسول اللہ ﷺ کے دورِ مبارک سے شروع ہوگیا تھا۔ رسول ﷺ نے ہرقل کو نامۂ مبارک بھیجا' ہرقل مشرقی سلطنت روم کا فرماں روا تھا''۔ (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰)

گویا اس مخالفت کا اصل سبب دعوتِ اسلام بنی اور جب خلافتِ راشدہ کی صورت میں اسلام کا عادلانہ نظام اپنی بہاریں دکھانے لگا تو اس مخالفت میں اضافہ ہوگیا' کیونکہ قیصر کی خدائی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اب کبریائی و خدائی صرف اللہ کا حق تھا۔ سارے انسان اللہ کی نیابت (خلافت) کے تو حقدار ہو سکتے ہیں لیکن خدائی منصب کسی کو نہیں مل سکتا۔ اس کی عملی شکل خلافت راشدہ کے زمانے میں سامنے آئی تو بندوں پر خدائی کا دعویٰ رکھنے والے خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ مسلمانوں نے ان کا مقابلہ میدان جنگ میں کیا۔ غازیؒ صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے (یعنی حضور ﷺ) بعد اصل تصادم اور مقابلہ خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا۔ صلیبی جنگوں کے بعد ایک طویل عرصے تک اسپین میں یہ مقابلہ جاری رہا' جنوبی یورپ کے ذریعے یہ سابقہ پیش آتا رہا۔ پھر استعمار اور ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے ذریعے ہوا۔ اس کے بعد گزشتہ سو سال سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔'' (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۰)

ڈاکٹر صاحب مرحوم کو شدید احساس تھا کہ مغربی دنیا اور اقوام متحدہ جیسے نام نہاد عالمی ادارے مسلمان ملکوں کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب گورے کی ہدایت آتی ہے کہ قیامِ امن کے لیے فلاں جگہ فوج بھیجو اور مسلمانوں کی بندوقوں کے ذریعے مسلمانوں کو زیر کر کے ہمارے مفادات کے لیے راہ ہموار کرو تو تیمور میں بھی فوج چلی جاتی ہے' صومالیہ میں بھی چلی جاتی ہے اور اریٹیریا میں بھی چلی جاتی ہے۔ دنیائے اسلام کے سپاہیوں کے ذریعے' دنیائے اسلام کی بندوقوں کے ذریعے' دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی تلواروں کے ذریعے مسلمانوں کی گردنیں کاٹی جائیں' اور ان کو کاٹ کاٹ کر عیسائی اور مسیحی ریاستیں قائم کی جائیں۔'' (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۴)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ انگریزوں کے گن گانے والوں کو آئینہ دکھاتے ہیں کہ ان کے ممدوحین کتنے مہذب اور انسان دوست تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں میں پنجاب میں سو فیصد تعلیم تھی' اور بحیثیت مجموعی ۸۴ فیصد تھی۔ اور جب انگریز ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے گیا تو پنجاب میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب ۴ فیصد تھا۔ انگریز سو کو چار پر لے آئے اور پوری قوم کو جاہل چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے اس دعوے کی حقیقت جو کہا جاتا ہے کہ مغربی ممالک کا ایک سویلائزنگ رول تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح اور مشرق بے زار لوگ کہتے ہیں کہ انگریز نے ہمیں سویلائز کر دیا۔ یہ

سویلائز کیا کہ سو فیصد تعلیم کو سو فیصد جہالت میں بدل دیا''۔ (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۲۶)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنا ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے جس سے مغربیوں کے سازشی کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ایک پروفیسر صاحب امریکہ سے تشریف لائے' وہ ایک مشہور امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ پروفیسر صاحب بہت سے لوگوں سے ملے' مجھ سے بھی ملے۔ مجھ سے ملنے کے بعد انہوں نے کہا کہ میں الگ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں' تم مجھ سے ملنے کے لیے آؤ۔ میں ان سے ملنے چلا گیا۔ دوران ملاقات انہوں نے کہا' امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے تم جس یونیورسٹی میں چاہو' میں تمہیں اسکالرشپ دے سکتا ہوں۔ میں نے کہا مجھے ہارورڈ میں داخلہ دلوا دیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے' تم ایک سال کے لیے امریکہ آؤ' ہارورڈ یونیورسٹی میں کورس ورک کرو' پھر واپس پاکستان آ جاؤ۔ انہوں نے جو نقد وظیفہ بتایا وہ اتنا تھا' جتنا اس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری کو بھی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں رہ کر یہ معلومات جمع کرو کہ پاکستان میں دینی مدارس کیا کام کرتے ہیں' کتنے دینی مدارس ہیں؟ کون کون علمائے کرام ان کو چلا رہے ہیں' وہ کیا کیا پڑھاتے ہیں' کیا ذہن بناتے ہیں؟ اور جو لوگ ان سے تیار ہوتے ہیں وہ بعد میں کیا کام کرتے ہیں' ان کا رویہ مغرب کے بارے کیسا ہوتا ہے؟ یہ ساری معلومات جمع کر کے آؤ' پھر میرے ساتھ بیٹھ کر اس کو مرتب کرو' اس کی بنیاد پر تمہیں ہارورڈ یونیورسٹی پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دے گی''۔ (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۳۴)

غازی صاحبؒ نے جس خوبصورتی سے مغرب کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی تدابیر کا ذکر کیا ہے وہ انہی کے ذہن رسا سے ہی ممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازے' آمین۔ غازیؒ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مسلمانوں کو بھی جھنجھوڑا ہے کہ وہ کھوکھلے نعروں سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنے دورۂ ازبکستان کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''۱۹۹۰ء میں مجھے ازبکستان جانے کا موقع ملا۔ میں نے صدر ازبکستان سے کہا کہ آپ ازبک نوجوانوں کو ہمارے تعلیمی اداروں میں آنے کی اجازت دیں۔ صدر صاحب مسکرائے اور انہوں نے کسی سے اپنی زبان میں کچھ کہا' اور اس نے ایک موٹی سی فائل لا کر صدر کے سامنے میز پر رکھ دی' صدر صاحب نے وہ فائل میری طرف لڑھکا دی۔ میں نے فائل کو کھولا تو اس میں اخبارات کے تراشے تھے اور ہمارے پاکستان کے بہت سے مذہبی' دینی سیاسی قائدین کے بیانات تھے کہ ہم فلاں جگہ جھنڈا لہرا دیں گے' اور سمرقند و بخارا کو آزاد کرا دیں گے۔ جب میں اس فائل کی ورق گردانی کر چکا تو صدر ازبکستان کہنے لگے کہ تم یہ سب کرنے کے لیے طلبہ

کو لے جانا چاہتے ہو؟ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس سوال کا جواب نہیں تھا''۔ (تعمیر افکار' اکتوبر ۲۰۰۷ء ص ۳۴)

متذکرہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے کہ غازیؒ صاحب محدود معنیٰ میں معلّم و مدرّس ہی نہیں تھے بلکہ عالمی حالات کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے۔ طوالت سے بچتے ہوئے مغرب کے چند جرائم کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کو وہ عالم انسانیت کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے۔ مثلاً عالمگیریت (Globalization) کو وہ مسلمانوں کے وسائل پر قبضے اور ان کے تشخص کو مٹانے کا ایک منصوبہ خیال کرتے تھے۔ مزید برآں وہ عالمگیریت کو انسانوں کے درمیان تفریق و تقسیم کا آلۂ کار گردانتے تھے۔ ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ اہل مغرب کو اسلام کے حوالے سے کوئی غلط فہمی یا مغالطہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر کے وہ دنیا کی توجہ اسلام سے ہٹانا چاہتے ہیں' کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ مستقبل اسلام کا ہے۔ مغرب کے متعصبانہ رویّے کے باوجود اسلام وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ خاص طور پر طبقۂ خواتین اسلام کی طرف زیادہ رجوع کر رہا ہے۔

غازیؒ صاحب کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے۔ آپ اپنی تعلیمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود جس طرح تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھتے تھے یہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ ان ہمہ جہتی مشاغل کے باوجود طبیعت میں ہمیشہ بشاشت ہوتی تھی۔ دگرگوں حالات میں بھی پُرامید (Optimistic) ہوتے تھے۔ عالم اسلام کے حوالے سے کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی بجائے وہ ہمیشہ روشن مستقبل کی بات کرتے تھے۔

آپ سماجی و معاشرتی تعلقات کا کتنا خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی یونیورسٹی میں اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود ایک دفعہ اپنی بیٹی کی دل جوئی کے لیے اس کی سہیلی کی مہندی کی رسم میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں پر جو ہندوانہ خرافات و رسومات دیکھیں تو ان پر بعد میں اپنی تقریر کے دوران تأسف کا اظہار بھی کیا اور کھل کر اس ہندوانہ ثقافت کی مخالفت کی اور برملا اعتراف بھی کیا کہ اس سے پہلے وہ اس قسم کی رسوم کو محض سماجی gatherings سمجھتے تھے' لیکن متذکرہ محفل میں انہوں نے دیکھا کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں پیلے کپڑے پہنے' ہاتھوں میں گیندے کے پھول اٹھائے ہوئے اور عجیب و غریب انداز سے الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہوئے محفل میں نمودار ہوئے تو وہ سخت پریشان ہوئے اور آئندہ کے لیے ایسی محافل میں شرکت نہ کرنے کا عزم کیا۔ ان کی مخالفت اور تنقید کا انداز بھی بہت پیارا ہوتا تھا۔ مثلاً انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کے دہرے معیار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''Dignity of man'' کی باتیں کرنے والوں کو اسلام کے قانونِ قصاص پر بڑا اعتراض ہے کہ اس میں ایک جان

ضائع ہو جاتی ہے۔خود کسی سے انتقام لینا ہو تو بستیوں کی بستیاں تاراج کر دیں گے لیکن قصاص میں ایک انگلی کے کٹنے پر یہ شور برپا کر دیتے ہیں۔ (روایت بالمعنیٰ)

ڈاکٹر صاحبؒ علم و عمل کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے منتظم بھی تھے۔آپ نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا۔یوں تو دعوۃ اکیڈمی' شریعہ اکیڈمی اور دیگر اداروں کے انتظام وانصرام باحسن طریق انجام دیے مگر اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے آپ نے جس نظم و نسق کا طلبہ و اساتذہ کو پابند بنایا اور ایک مثالی تعلیمی ماحول قائم کیا وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی تھا۔

عام طور پر ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو صرف ایک دینی سکالر اور ماہر تعلیم سمجھا جاتا ہے لیکن فی لواقع وہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔وہ ایک مجتہد و فقیہہ ہونے کے علاوہ ایک مصلح کی سی شان کے حامل بھی تھے۔ان کی بہت ہی پختہ رائے تھی کہ اسلام کے عادلانہ نظام کے اندر انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا موجود ہے اور آج اگر اس نظامِ عدل وقسط کو دنیا میں قائم کر کے دکھا دیا جائے تو دنیا اسلام کی طرف لپک پڑے گی اور باطل نظاموں کے مظالم میں گھری ہوئی انسانیت سکھ کا سانس لے سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

''عالمِ قرآنی یا قرآنی دنیا سے مراد انسانی زندگی کا وہ ڈھنگ ہے جو قرآن مجید کی تعلیم وہدایات پر استوار ہو۔گذشتہ تین صدیوں سے اسلامی ادبیات اور اسلامی فلسفہ سیاست و قانون کا سب سے اہم موضوع یہی رہا ہے کہ اس مثالی دنیا کو از سرنو دریافت کیا جائے جو ہر مسلمان کے دل کی آواز ہے' جو مشرق و مغرب کے اہل ایمان کے لیے ایک ایسے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے جس کے حصول کی خاطر نہ معلوم کتنی نسلیں قربانیاں دیتی چلی آرہی ہیں۔نہ معلوم کتنی سعید روحیں اس ہدف کے حصول میں جانوں کا نذرانہ پیش کر چکی ہیں۔نہ معلوم کتنے اہل علم و دانش کے شب و روز اس عالم منتظر کی تفصیلات پر غور وخوض کرنے میں صرف ہوئے ہیں۔یہ عالم قرآنی دنیائے اسلام کی وہ منزلِ مقصود ہے جس تک پہنچنے کے لیے لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں نے جان و مال کی بازیاں لگائی ہیں۔مسلم سیاسی مفکرین نے حکومت الٰہیہ' خلافت ربانی' اسلامی حکومت اور اسلامی ریاست کے عنوانات کے تحت اسی جہانِ مطلوب کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے۔فقہائے اسلام نے نفاذ شریعت اور فقہ اسلامی کی تدوین نو کے موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ اسی ہدف کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔احیائے اسلام اور ملت اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے گزشتہ چند صدیوں میں جو کاوشیں ہوئی ہیں ان کی منزل مقصود بھی ایک ایسی دنیا کی تشکیل تھی جہاں قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ کو سامنے رکھ کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اسلامی ڈھنگ اپنائے جاسکیں''۔(محکماتِ عالم قرآنی صفحہ ۴'۵)

ڈاکٹر صاحبؒ نے علامہ اقبال کے حوالے سے عالم قرآنی کے چار محکمات کا ذکر کیا ہے یعنی ''خلافتِ آدم، حکومت الٰہی، زمین ملک خدا ہے اور حکمت خیر کثیر ہے''۔ (محکمات عالم قرآنی صفحہ۲۱) اسلام کے عادلانہ نظام، جس کو وہ عالم قرآنی کہتے ہیں، کے قیام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک علم الادیان اور علم الابدان کی دوئی کو ختم نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں ان کا موقف یہ تھا کہ دینی و مذہبی علوم، علم وحکمت کی اساس ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کے دائرے میں علم اسماء وعلم تجربی (Modern Scientific Knowlege) بھی شامل ہیں۔ علوم وفنون کی یہ وحدتِ اسلام کے تصور علم کی بنیاد ہے۔ تعلیم میں دوئی سے فکر ونظر میں دوئی پیدا ہوتی ہے، اور فکر ونظر میں دوئی سے اس وحدتِ فکر وعمل پر زد پڑتی ہے جو عقیدۂ توحید کے لازمی نتیجے کے طور پر اُمتِ مسلمہ میں قائم رہنی چاہیے۔

ڈاکٹر غازیؒ کی فکری پختگی کا مظہران کی مغرب کے بارے میں منفرد رائے ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو سیکولر کی بجائے مسیحی کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے ہاں بہت سے حضرات سادہ لوحی سے مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور مغرب کے ظاہری دعووں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو گھر سے نکال دیا ہے، اور اب مغرب ہر مذہبی تعصب سے آزاد ہے۔ وہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو ایک خاص علاقے سے نکالا ہے، گھر سے نہیں نکالا۔ مغرب کی ہر چیز عیسائی تہذیب وتمدن، عیسائی روایات اور عیسائی تعصبات پر مبنی ہے''۔ (تعمیر افکار اکتوبر ۲۰۰۱ء ص۲۱)

ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ کی زندگی کے یہ وہ پہلو ہیں جن کا کسی درجے میں راقم الحروف کو علم تھا۔ آئندہ کوئی صاحب عزم وہمت ان کی زندگی پر تحقیق کر کے ان کی شخصیت کے مزید پہلوؤں کو اجاگر کر سکتا ہے۔ ایسی نابغۂ روزگار شخصیات کے بارے میں آگاہی آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام دے گی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی دینی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے، اور ہم سب کو ان کا سا جذبہ اور اخلاص عطا فرمائے۔ جس لگن ومحنت سے انہوں نے دین وملت کی خدمت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اللہ ہمیں اس میں سے کچھ حصہ نصیب فرمائے۔ **اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وحاسبہ حسابا یسیرا۔ آمین یا رب العالمین!**

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بقیہ: عرضِ احوال

ہے' حالانکہ ایک حدیث مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے رحم میں بچہ کس سٹیج پر ہوتا ہے جب ایک فرشتہ کے ذریعے اس جسم حیوانی میں روح کی آمیزش کر دی جاتی ہے' جان تو اس جسم حیوانی میں پہلے سے ہی موجود ہوتی ہے' بلکہ جان تو اس نطفہ میں بھی موجود ہوتی ہے جو رحم مادر میں داخل ہو کر بچہ پیدا ہونے کے عمل کا بالکل آغاز کر دیتا ہے۔ بہرحال ہمیں اس وقت ان لوگوں کو قائل بھی نہیں کرنا جو جان اور روح کے معاملے میں مغالطے میں ہیں۔ ہم نے اتنی طویل تمہید اس لیے باندھی ہے کہ انسان جسم و جان کے علاوہ حاملِ روح بھی ہے اور اس روح کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ اگر وہ دوسرے جانداروں کی طرح اپنی تمام تر توجہ اپنے جسم و جان پر مرکوز رکھے گا اور روح سے مکمل طور پر غافل رہے گا تو پھر وہ کس بنیاد پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعوے دار ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خدا' رسول اور آخرت کا انکار کرنے والا اگر اپنے انکار میں مخلص ہے تو وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مجھے مادر زاد ننگا رہنا چاہیے اور جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے فریق ثانی کا مخالف جنس ہونا ضروری ہے' نکاح' شادی اور رشتوں کی حُرمت سب بے کار باتیں ہیں۔ اور اب تو بے حیائی اور بیہودگی اِس حد تک بڑھ چکی ہے کہ فریقِ ثانی کا جنسِ مخالف ہونا بھی ضروری نہیں ہے گویا اس حوالہ سے انسان بے روح جانداروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہماری رائے میں اگر کوئی الحاد کا دعوے دار اور دین و مذہب کا منکر ایسی پابندیوں کا اگر کسی نہ کسی سطح پر قائل ہے تو وہ اپنے الحاد میں مخلص نہیں۔ اگرچہ انتہائی کمزور اور مضمحل ہی سہی لیکن کوئی شے ہے جو اسے فطرت کا راستہ دکھا رہی ہے۔ ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتے کہ مخلص ملحد روح سے خالی ہوتا ہے' البتہ یہ بات یقینی ہے کہ اس کا ذہن اور فکر اس قدر مسخ ہو چکے ہوتے ہیں کہ روح نہ سہی روح کی پکار ضرور مر چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل انسانیت کیا ہے' حقیقت میں اشرف المخلوقات کون ہے' اخلاقی درجات کی بلندی کس کو حاصل ہوتی ہے' جتنی جتنی کوئی اپنی روح کی پکار پر لبیک کہتا ہے معراجِ انسانیت کے حوالہ سے اس کی منزل قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ جیسے کھانے پینے اور عیش و آرام سے اور جسم کے تقاضے پورے کرنے سے جسم فربہ ہوتا ہے اسی طرح روح کی پکار پر کان دھرنے سے اور روح کی بالیدگی کے لیے محنت و مشقت کرنے سے روح توانا ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ جان اور جسم کا تعلق مٹی سے ہے لہٰذا اسے خوراک بھی مٹی سے دستیاب ہوتی ہے اور روح امرِ ربی ہے اس لیے اس کی بہترین

خوراک کلامِ ربانی ہے۔ ہمیں دوسرے جانداروں کی طرح اپنے جسم کی حفاظت اور پرورش کرنی چاہیے' اس لیے کہ زندہ معاشرے میں صحت مند زندگی گزارنا لازمی ہے۔ بیمار اور لاغر جسم معاشرے میں مؤثر اور غالب رول ادا نہیں کر سکتا' لیکن جسم و جان کی یہ ضرورت ۶۰'۷۰ یا زیادہ سے زیادہ ۸۰ سال تک ہوتی ہے' جبکہ قفسِ عنصری سے روح کی پرواز نے انسان کو جس جہان میں پہنچانا ہے وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ہے' لہٰذا مذہبی احکامات اور عقائد کے ساتھ ساتھ عقل اور منطق کی بنیاد پر بھی اگر پوچھا جائے کہ انسان جسے روح کا پیوند لگا کر دوسرے جانداروں سے الگ تھلگ کیا گیا ہے اسے کس میدان میں زیادہ محنت کرنی چاہیے اور اسے جسم اور روح کے تقاضوں میں سے کس کو اولیت اور اہمیت دینی چاہیے تو جواب انتہائی آسان اور سادہ ہوگا کہ روح کی بالیدگی اور توانائی کے لیے زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ روح چونکہ خود پاکیزہ اور طیب ہے لہٰذا روح کی پکار پر قائم ہونے والا معاشرہ بھی جنت نظیر ہوگا۔ اور جسم و جان کے تقاضے چونکہ بے لگام اور بے ہنگم ہوتے ہیں اور خود غرضی ان کا مرکز و محور ہوتا ہے' حلال و حرام اور جائز و ناجائز ان کا مسئلہ نہیں ہوتا' لہٰذا معاشرہ ایک جنگل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پاکستانی معاشرے پر نگاہ ڈالیں' آپ کو مکمل طور پر جنگل کا نقشہ نظر آئے گا' چھوٹے اور کمزور سہمے ہوئے جبکہ مقتدر اور بڑے غراتے اور چنگھاڑتے ہوئے' حکمران بے چنگ درندوں کی صورت میں اور عوام ہرنوں اور خرگوشوں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مغرب کا معاشرہ ظاہر اور باہر سے بہت مہذب اور انصاف پسند نظر آتا ہے لیکن اندرون چنگیزیت کو شرما دینے والا ہے۔ وہاں ظلم و ستم اور جبر و استبداد افراد نہیں اقوام کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں نے صرف عراق میں ایک سال میں ایک لاکھ نو ہزار معصوم شہریوں کو بلاعذر اور بلاجواز شغل کے طور پر ہلاک کیا' ان سفید بھیڑیوں کے ظلم اور سفاکی کی داستان اتنی طویل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ قصہ مختصر' روح اور اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے سے مغربی معاشرہ خالصتاً درندوں کا معاشرہ بن کر رہ گیا ہے' فرق صرف یہ ہے کہ وہ اپنوں اور غیروں میں تمیز کرتے ہیں (ثبوت کے لیے وکی لیکس کے انکشاف کفایت کریں گے) لہٰذا پاکستان ہو یا یورپ انسانی مسائل کا صرف یہ حل ہے کہ انسان روح کے تقاضوں کو بر لائے تب ہی انسان اور جاندار میں تمیز ہو سکے گی' تب ہی جنگل کا معاشرہ اور انسانوں کا معاشرہ اور ہوگا۔ جس معاشرے میں روح کی اہمیت اور فضیلت ختم ہو جائے گی اور انسانوں کے اجسام ارواح کے مزار بن جائیں گے وہ محض دو ٹانگوں والے جانداروں کا ترقی یافتہ جنگل ہوگا۔ oo

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبوی ﷺ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبی ﷺ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

۞ صفحات: 375 ۞ قیمت اشاعت خاص: 300 روپے اشاعت عام: 200 روپے

۞۞۞

"منہج انقلابِ نبوی ﷺ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ انقلاب

۞ صفحات: 64 ۞ قیمت اشاعت خاص: 40 روپے ۞ اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501